اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

اکتوبر ۲۰۲۴ء

مُدِیر: پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

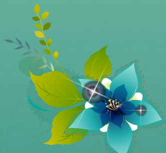

CPL No. 296 Monthly Al Burhan October 2024

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین صاحب کی فکر انگیز کتاب 'مسلم نشأۃ ثانیہ' کا تیسرا نظر ثانی شدہ ایڈیشن

''عروجِ اُمتِ مُسلمہ''

کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔

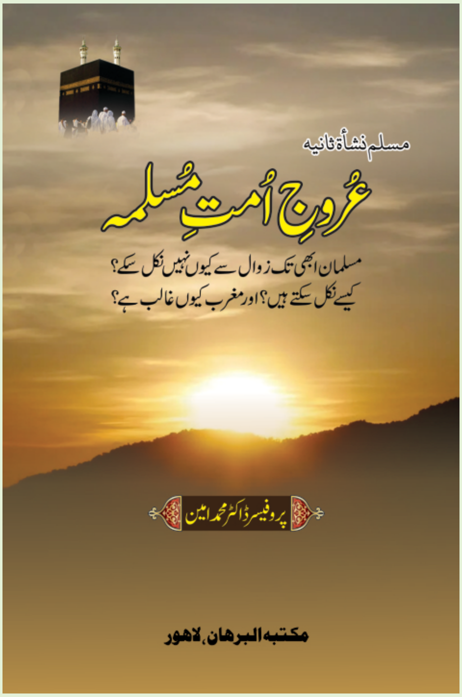

مسلمان کیوں زوال پذیر ہوئے؟ وہ زوال سے کیسے نکل سکتے ہیں؟

مغرب کیوں غالب ہے؟

صفحات ۳۸۴

ان سوالات کا مدلل اور مسکت جواب

مکتبہ البرہان

136-نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

0300-4107282 0336-1913636

تدریس القرآن

سبق: ۸

قرآن حکیم کا ترجمہ سیکھنے کے لیے

(آیت: ۲۶-۲۹)

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ

اٰيَاتُهَا ۲۸۶ | رُكُوْعَاتُهَا ۴۰

وَاِذْ قَالَ	رَبُّكَ	لِلْمَلٰٓئِكَةِ	اِنِّيْ	جَاعِلٌ	فِي الْاَرْضِ	قَالَ	قیل وقال، قول، اقوال
اور جب کہا	رب تمہارے نے	فرشتوں سے	کہ میں	بنانے والا ہوں	زمین میں	لِلْمَلٰٓئِكَةِ	مَلَک الموت، ملائکہ
اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک							

خَلِيْفَةً ؕ	قَالُوْٓا	اَتَجْعَلُ	فِيْهَا	مَنْ	يُّفْسِدُ	خَلِيْفَةً	خلافت، خلیفہ، خلفاء
خلیفہ۔	انہوں نے کہا	کیا آپ بنائیں گے	اس میں	جو	فساد کرے گا	يُّفْسِدُ	فساد، مفسد، فسادی، فاسد
خلیفہ بنا رہا ہوں تو انہوں نے کہا کہ کیا آپ اسے بنائیں گے جو زمین میں فساد پھیلائے گا							

فِيْهَا	وَيَسْفِكُ	الدِّمَآءَ ۚ	وَنَحْنُ	نُسَبِّحُ	بِحَمْدِكَ	يَسْفِكُ	سفّاک قاتل، سفّاکی
اس میں	اور وہ بہائے گا	خون	جبکہ ہم	ہم تسبیح کرتے ہیں	آپ کی حمد کے ساتھ	نُسَبِّحُ	تسبیح، تسبیحات، تسبیح وتہلیل
گا اور خون بہائے گا جبکہ ہم آپ کی حمد کے ساتھ آپ کی تسبیح کرتے ہیں						بِحَمْدِكَ	حمد ونعت، حامد، محمد، محمود

وَنُقَدِّسُ	لَكَ ؕ	قَالَ	اِنِّيْٓ	اَعْلَمُ	مَا	نُقَدِّسُ	تقدیس، مقدس مقامات
اور ہم پاکی بیان کرتے ہیں	آپ کی	اس نے کہا	بے شک	میں جانتا ہوں	جو	اَعْلَمُ	علم، علوم، علماء، عالم، علامہ
اور آپ کی تقدیس کرتے ہیں تو اللہ نے فرمایا کہ جو مَیں جانتا ہوں							

لَا	تَعْلَمُوْنَ ﴿30﴾	وَعَلَّمَ	اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ	كُلَّهَا	ثُمَّ	الْاَسْمَآءَ	اسم گرامی، اسمائے حسنہ، اسم بامسمی
نہیں	تم جانتے۔	اور اس نے سکھائے	آدم کو نام	سارے	پھر		
وہ تم نہیں جانتے۔ پھر اللہ نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھائے،							

عَرَضَهُمْ	عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ	فَقَالَ	اَنْۢبِـُٔوْنِيْ	بِاَسْمَآءِ	عَرَضَهُمْ	عرض کرنا، معروضات
اس نے پیش کیا ان کو	فرشتوں پر	اور اس نے کہا	تم خبر دو مجھے	سے ناموں	اَنْۢبِـُٔوْنِيْ	نبی، انبیاء، نبوت
اور اسے فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور ان سے کہا کہ تم						

هٰٓؤُلَآءِ	اِنْ	كُنْتُمْ	صٰدِقِيْنَ ﴿31﴾	قَالُوْا	سُبْحٰنَكَ	لَا	عِلْمَ	صٰدِقِيْنَ	صدق، صادق، مصدق، مصداق
ان کے	اگر	تم ہو	سچے۔	انہوں نے کہا	پاک ہیں آپ	نہیں	علم	سُبْحٰنَكَ	سبحان اللہ، تسبیح کرنا
ان چیزوں کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو۔ انہوں نے کہا پاک ہے آپ کی ذات ہمیں تو اتنا									

لَنَآ	اِلَّا	مَا	عَلَّمْتَنَا ؕ	اِنَّكَ	اَنْتَ	الْعَلِيْمُ	الْحَكِيْمُ ﴿32﴾	عَلَّمْتَنَا	علم، عالم، معلم، متعلم، تعلیم
ہم کو	مگر	جو	سکھایا آپ نے ہمیں	بے شک آپ	تو	علم رکھنے والا	حکمت والا ہے۔	الْحَكِيْمُ	حکمت و دانائی، حکیم
ہی علم ہے جتنا آپ نے دیا ہے۔ بے شک آپ علم بھی رکھتے ہیں اور حکمت بھی									

قَالَ	يٰٓاٰدَمُ	اَنْۢبِئْهُمْ	بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ	فَلَمَّآ	اَنْۢبَاَهُمْ	اَنْۢبِئْهُمْ	نبی، انبیاء، ختم نبوت
اس نے کہا	اے آدم	تم بتاؤ ان کو	ان کے نام	پھر جب	اس نے خبر دی ان کو	بِاَسْمَآئِهِمْ	اسم گرامی، اسماء، مسمّٰی، مسماۃ
اللہ نے کہا اے آدم ان (فرشتوں) کو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ تو جب اس نے انہیں							

بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ	قَالَ	اَلَمْ	اَقُلْ	لَّكُمْ	اِنِّیْٓ	اَقُلْ	قیل وقال، اقوال، قول و اقرار
ان کے ناموں سے	اس نے کہا	کیا نہیں	میں نے کہا تھا	تم سے	کہ بے شک میں	اَعْلَمُ	علم، عالم، علامہ، علوم
چیزوں کے نام بتا دیے تو (اللہ نے) کہا کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ مَیں							

اَعْلَمُ	غَيْبَ	السَّمٰوٰتِ	وَالْاَرْضِ ۙ	وَاَعْلَمُ	مَا	غَيْبَ	غیبی قوت، غائب، غیبت
میں جانتا ہوں	چھپی باتیں	آسمانوں	اور زمین کی	اور میں جانتا ہوں		تُبْدُوْنَ	بادیٔ النظر، بادیہ پیمائی
جانتا ہوں کہ میں زمین و آسمان کی چھپی تمام باتیں اور وہ بھی جانتا ہوں جو							

تُبْدُوْنَ	وَمَا	كُنْتُمْ	تَكْتُمُوْنَ ﴿33﴾		تَكْتُمُوْنَ	کتمِ شہادت، کتمانِ حق
تم ظاہر کرتے ہو	اور جو	ہو تم	تم چھپاتے ہو۔			
تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے رہے ہو۔						

اہم نکات

مشکل الفاظ کے معانی

① اکٹھے لکھے گئے الفاظ: لِلْمَلٰٓئِكَةِ = لِ + اَلْ + مَلَآئِكَةِ

عَلَّمْتَنَا = عَلَّمْتَ + نَا   بِاَسْمَآئِهِمْ = بِ + اَسْمَآءِ + هِمْ

② خلیفہ کے لفظی معنی اس شخص کے ہیں جو اصل مالک کے اختیارات استعمال کرے۔ انسان اللہ کا خلیفہ ان معنوں میں ہے کہ اللہ نے انسان کو حق کو قبول کرنے نہ کرنے اور اپنی کائنات میں تصرف کا اختیار اسے دیا ہے۔

حاصل کردہ سبق

① جس بات کا یقینی علم نہ ہو اس میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ ② اپنے اختیار کا غلط استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

③ ہدایت صرف وہ ہے جو اللہ تعالیٰ دے کیونکہ وہ سب کچھ جانتا ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا سب کچھ نہیں جانتا لہٰذا ہدایت صرف اللہ ہی سے طلب کرنی چاہیے اور صرف اس کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارنی چاہیے۔

ماہنامہ البرہان لاہور
Since 2010
جلد ۲۸ شمارہ ۱۰
برائے آن لائن مطالعہ
www.alburhaan.pk
اکتوبر ۲۰۲۴ء / ربیع الاوّل ۱۴۴۶ھ

آئینہ مضامین

فکرونظر
پیغامِ انقلاب ۴

ربیع الاوّل کا پیغام
- قرآن اور سیرت — مولانا ابوالکلام آزادؒ — ۵
- نغمۂ محمدی (نعت) — جان وولف وین گوئٹے — ۷

عالم اسلام/فلسطین
ایک شہید فلسطینی بچے کی وصیت — محمد عبدالقادر الحسینی شہید — ۱۰

تعلیم و تربیت
- امام غزالیؒ: کا تصورِ علم، تعلیم اور تزکیہ — پروفیسر بختیار حسین صدیقی — ۱۱
- پنجاب کے کالجوں میں مخلوط تعلیم کی بھرمار — پروفیسر عاصم حفیظ — ۲۳

تفہیم دین
حرم مکی اور مدنی کی انتظامیہ کی خدمت میں چند گزارشات — مدیر — ۲۶
عمرہ اور حج پر جانے والی خواتین و حضرات توجہ فرمائیں

اسلام اور پاکستان
قادیانیت اور سپریم کورٹ کا فیصلہ — پروفیسر ڈاکٹر محمد امین — ۳۲

غامدیت
قادیانیت اور غامدیت کے مشترکہ افکار — ڈاکٹر مولانا الیاس فیصل — ۳۴

فکرودانش
مصنوعی ذہانت، ٹرانس ہیومنزم اور مابعد انسان — شیخ کبیر ہیل مِنسکی — ۳۹

اسلام اور مغرب
کیا احتجاج سے نفاذ اسلام کی راہ ہموار ہوسکتی ہے؟ — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۴۷

تبصرۂ کتب
- ماہنامہ ترجمان القرآن کا 'احیائے اسلام' نمبر — مدیر — ۵۳
- مولانا ظفر علی خان اور اُن کا عہد — حافظ عمران طحاوی — ۶۰

English Section ۶۶
Why revolution is no longer possible?
Byung-Chul Han

مدیر
ڈاکٹر محمد امین

ادارۂ تحریر
ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
حافظ محمد عمران طحاوی

لیگل ایڈوائزر
محمد یحییٰ رشید، ایڈوکیٹ ہائی کورٹ

انچارج سرکولیشن
(0300-4107282)
[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 85 روپے
سالانہ 1000 روپے۔ پانچ سال: 5000 روپے
تاحیات 20,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ
سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور
PK92SONE0000120000056341

برائے رابطہ
136 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف
0306-4640366

فکرونظر

پیغامِ انقلاب

اُٹھو! مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمَرا کے در و دیوار ہِلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہُو سوزِ یقیں سے
کُنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

سُلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کُہَن تم کو نظر آئے، مِٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کیوں خالق ومخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو

حق را بسجودے، صنَماں را بطوافے
بہتر ہے چراغِ حَرم و دَیر بُجھا دو

میں ناخوش و بیزار ہُوں مَرمَر کی سِلوں سے
میرے لیے مٹّی کا حرم اور بنا دو

تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے
آدابِ جُنوں شاعرِ مشرِق کو سِکھا دو

اقبالؒ

ربیع الاوّل کا پیغام مولانا ابوالکلام آزادؒ

قرآن اور سیرت

حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف اس عہد میں بلکہ جب تک دنیا باقی ہے صاحبِ قرآن کی سیرت وحیاتِ مقدس کے مطالعے سے بڑھ کر نوع انسانی کے تمام امراضِ قلوب وعللِ ارواح کا اور کوئی علاج نہیں۔ اسلام کا دائمی معجزہ اور ہمیشگی کی حجۃ اللہ البالغہ قرآن کے بعد اگر کوئی چیز ہے تو وہ صاحبِ قرآن کی سیرت ہے اور دراصل قرآن اور حیات نبوۃ معناً ایک ہی ہیں۔ قرآن متن ہے اور سیرۃ اس کی تشریح۔ قرآن علم ہے اور سیرۃ اس کا عمل۔ قرآن صفحات وقراطیس مابین الدفتین اور فی صدور الذین اوتوا العلم۔ "ان لوگوں کے سینوں میں جنہیں علم دیا گیا ہے۔" میں ہے اور یہ ایک مجسم وممثل قرآن تھا جو یثرب کی سرزمین پر چلتا پھرتا نظر آتا تھا۔ کما قالت الصدیقه رضي الله عنها۔ و کان خلقه القرآن۔

انبیائے کرام کی زندگی سے بڑھ کر "یقین" اور "ایمان" کی پکار اور کیا ہو سکتی ہے؟ محالِ قطعی ہے کہ ایک صاحبِ استعداد سیرۃ نبویہ کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا ٹکڑا بھی پیش نظر رکھتا ہو، پھر شک واضطرابِ نفس کا افسونِ ہلاکت اس پر کارگر ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جابجا انبیائے کرام علیہم السلام کے نفسِ زندگی ووجود کو بطور ایک حجت وبرہان کے پیش کیا ہے، نہ کہ محض بطور قصص واظہار علم ماسبق وانباء بالغیب کے، جیسا کہ عموماً سمجھا گیا ہے۔

انبیاء کی زندگی اور قرآن

قرآن کا کھلا کھلا دعویٰ یہ ہے کہ ہر نبی کی زندگی جس طرح شروع ہوئی اور جس طرح ختم ہوئی۔ جو کچھ اس پر گزرا اور قولاً وفعلاً جو کچھ اس سے تعلق رکھتا ہے، ان میں سے ہر بات بجائے خود ایک دلیل اور برہان حق ہے۔ اس سے بڑھ کر اس حقیقت کے اثبات کے لیے اور کوئی دلیل یقینی وقطعی نہیں ہو سکتی کہ خدا ہے، ساری اچھی اور حسین صفتوں سے متصف ہے۔ اس نے جس طرح عالم ہستی اور ما فیہا کو بنایا اسی طرح اس کے لیے قوانین ونوامیس عمل ونتائج بھی بنائے اور وہ ہر حال میں اٹل ہیں۔ دنیا میں انسان زیادہ سے زیادہ اور قطعی سے قطعی یقین جن

چیزوں پر رکھتا ہے اور جن وسائل سے ان کے یقینی ہونے کو مانتا ہے، قرآن کی یہ دلیل سب سے زیادہ قطعی اور سب سے زیادہ روشن و محکم ہے اور اگر یقین کے لیے یہ دلیل کافی نہیں تو پھر اس دنیا میں یقین کا وجود بھی نہیں، حتیٰ کہ دوپہر کے وقت چمکتے ہوئے سورج کا بھی اور جسم کے ایک ایک مسام سے چھوتی اور لگ کر چلنے والی ہوا کا بھی نہیں۔ اگر تم کہتے ہو کہ دنیا میں صرف انہی باتوں کو ماننا چاہیے جو یقینی ہوں اور ثابت شدہ یعنی تمام اعتقاد کے لیے صرف امکان کو کافی نہیں سمجھتے۔ اثبات کے طلب گار ہو، تو جب بھی دنیا میں ''الکلم الطیب'' اور ''العمل الصالح'' سے بڑھ کر اور کون سی ثابت وواقع حقیقت ہوسکتی ہے؟ خود تمہارا وجود اور اثبات ''انا'' بھی اس سے زیادہ ثابت و مشہور نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جا بجا دعوت الی الوحی کو ''قول الثابت'' اور ''دین القیم'' اور ''الواقع'' اور ''الثابت'' وغیرہ سے تعبیر کیا ہے۔ لوگ دوسری طرف چلے گئے۔

حجۃ قائمہ

بہرحال حضرت نوحؑ کا وجود بجائے خود ایک دلیلِ اثبات ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اپنی ذات کے اندر خود ایک حجۃ قائمہ اور آیۃ کاملہ ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کی پوری زندگی صرف ایک لفظ میں بتلادی جاسکتی ہے، برہان محکم و دلیل ثابت اور اسی طرح تمام انبیاء و مرسلین اور بوجہ ان کی تبعیت ومعیت کے تمام نفوسِ صادقہ بشر من الصدیقین والشہداء والصالحین علیہم السلام کی زندگیاں اور تمام وقائع واعمال بجائے خود ایک مستقل دلیل و برہان حق ہیں اور اسی طرح ہر نبی کا تنہا وجود سیکڑوں دلیلوں اور ہزاروں شہادتوں کا مجموعہ ہے۔ اس لیے قرآن حکیم ان کا استشہاداً واستدلالاً ذکر کرتا اور ان کو ''آیت'' اور ''بیّنہ'' سے تعبیر کرتا اور اس طرح گویا ہر ایک تذکرہ وحکایت حیاتِ نبوت وماجاء بالحق میں دنیا کے سامنے صدہا دلیلیں اور روشنیاں چمکا دیتا ہے۔ علی الخصوص یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جابجا حضرت ختم المرسلین وصاحبِ اسوۂ حسنہ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کو بطور ایک مستقل دلیل وشاہد ثابت کے پیش کیا ہے اور نہایت کثرت سے ان کی سیرت وسوانح اور وقائع وایام پر مختلف پیرایوں اور مختلف لواحق وسوابق اور روابط کے ساتھ بار بار توجہ دلائی ہے اور بسا مقامات میں ایسا بھی ہے کہ:

گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

(بقیہ صفحہ نمبر:۹)

ربیع الاوّل کا پیغام

جرمنی کا مشہور شاعر جان وولف وین گوئٹے
اردو ترجمہ: ڈاکٹر شان الحق حقی

نغمۂ محمدی (نعت)

وہ پاکیزہ چشمہ
جو اوجِ فلک سے چٹانوں پہ اترا
سحابوں سے اوپر بلند آسمانوں پہ جولاں ملائک کی چشم نگہداشت کے سائے سائے
چٹانوں کی آغوش میں عہد برنائی تک جوئے جولاں بنا
چٹانوں سے نیچے اترتے اترتے
وہ کتنے ہی صد رنگ اَن گھڑ خزف ریزے
آغوشِ شفقت میں اپنی سمیٹے
بہت سے سسکتے ہوئے رینگتے، سُست کم مایہ سوتوں کو چونکاتا، للکارتا ساتھ لیتا ہوا خوش خراماں چلا
بے نمو وادیاں لہلہانے لگیں
پھول ہی پھول چاروں طرف کھل اٹھے
جس طرف اُس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا رخ پھر گیا
اُس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فیضِ قدم سے بہار آ گئی
یہ چٹانوں کے پہلو کی چھوٹی سی وادی ہی کچھ
اُس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی منزل نہ تھی
وہ تو بڑھتا گیا
کوئی وادی، کوئی دشت، کوئی چمن، گلستاں، مرغزار

اُس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پائے رواں کو نہ ٹھہرا سکا
اُس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آگے ابھی اور صحرا بھی تھے
خشک نہریں بھی تھیں، اُترے دریا بھی تھے۔
سیلِ جاں بخش کے، اُس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سب منتظر
جوق در جوق پاس اُس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آنے لگے
شورِ آمد کا اُس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اٹھانے لگے
راہبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ساتھ ہم کو بھی لیتے چلو
کب سے تھیں پستیاں ہم کو جکڑے ہوئے
راہ گھیرے ہوئے، پاؤں پکڑے ہوئے
یاد آتا ہے مسکن پرانا ہمیں
آسمانوں کی جانب ہے جانا ہمیں
ورنہ یونہی نشیبوں میں دھنس جائیں گے
جال میں اِن زمینوں کے پھنس جائیں گے
اپنے خالق کی آواز کانوں میں ہے
اپنی منزل وہیں آسمانوں میں ہے
گرد آلود ہیں پاک کر دے ہمیں
آ، ہم آغوشِ افلاک کر دے ہمیں
وہ رواں ہے، رواں ہے، رواں اب بھی ہے
ساتھ ساتھ اُس کے اک کارواں اب بھی ہے
شہر آتے رہے شہر جاتے رہے

اُس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دم سے سبھی فیض پاتے رہے

اُس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہر موڑ پر ایک دنیا نئی

ہر قدم پر طلوع ایک فردا نئی

قصر ابھرا کیے خواب ہوتے گئے

کتنے منظر تہہِ آب ہوتے گئے

شاہ اور شاہیاں خواب ہوتی گئیں

عظمتیں کتنی نایاب ہوتی گئیں

اُس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحمت کا دھارا ہے اب بھی رواں

از زمیں تا فلک

از فلک تا زمیں

از ازل تا ابد جاوداں، بیکراں

دشت و در، گلشن و گل سے بے واسطہ

فیض یاب اس سے کل

اور خود کل سے بے واسطہ

بقیہ: قرآن اور سیرت

کا معاملہ ایک کیفیتِ خاص اور لذتِ اشارات ارباب راز دیناز کے ساتھ اصحابِ نظر و ذوق کے لیے قرۃ عیون اور سرور نفس کا حکم رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض عرفاء و اصحاب اشارات نے کہا ''بائے''، بسم الہل سے ''س'' والناس تک جو کچھ ہے، گویا حکایت موسیٰ کلیم کی ہو اور یوسف صدیق کی (صلوۃ اللہ علیہما) لیکن ان سب سے مقصود ایک ہی ہے اور گو نام دوسروں کے ہوں مگر روئے سخت اسی طرف ہے۔

عالم اسلام/فلسطین محمد عبدالقادر الحسینی شہید

بے حس عربو اور مسلمانو! میں تمہاری شکایت جا کر اللہ سے ضرور کروں گا

ایک شہید فلسطینی بچے کی وصیت

غزہ کا ایک بچہ ''محمد عبدالقادر الحسینی'' شہید ہوتا ہے اور شہادت سے پہلے ایک وصیت لکھ کر جاتا ہے....اس وصیت کا ایک ایک لفظ ایٹم بم ہے، اگر دل میں ایمان اور احساس باقی ہو۔ لکھتا ہے:

''اگر میں اس جنگ میں شہید ہو جاؤں اور دنیا سے چلا جاؤں تو میں عرب (اور مسلم) حکمرانوں کو ہرگز معاف نہیں کروں گا جنہوں نے ہمیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔

ہم نے محاصرے میں بہت مشکل دن گزارے، بغیر کھائے پیے....کم عمری کے باوجود میرے بال سفید ہو گئے۔ اللہ تمہیں معاف نہ فرمائے، تم سے درگزر نہ کرے۔

اللہ کی قسم! میں سات آسمانوں اور زمین کے خالق سے تمہاری شکایت ضرور کروں گا۔

میری ماں! مجھے معاف کرنا، مَیں تم سے بہت محبت کرتا ہوں، میری جدائی پر غم نہ کرنا۔

میرا یہ خط مصر، یمن، اردن، الجزائر، لیبیا، لبنان، تیونس، سوڈان، صومال اور ملائیشیا کے عوام کے نام ہے۔

غزہ تمہارے پاس امانت ہے۔ غزہ کو اپنے حال پر نہ چھوڑنا....غزہ کو بھول نہ جانا۔ مَیں تمہیں قسم دیتا ہوں اور اس کی وصیت کرتا ہوں۔ مجھے تم سب سے محبت ہے بہت زیادہ۔ پس تم ہمیں بے یار و مددگار مت چھوڑنا۔ میرا خط امانت ہے، اسے بھلا مت دینا۔'' مَیں شہید ہوں، ان شاء اللہ۔ عبدالقادر الحسینی ۲۵/ ۳/ ۲۰۲۴ء

البرہان

پاکستانیو! شرم سے ڈوب مرو، اگر تم میں حمیت ہے۔ شہید بچے نے پاکستان کا نام نہیں لیا کیونکہ اسے پاکستانی حکمرانوں اور عوام سے توقع ہی نہیں تھی کہ وہ غزہ کا ساتھ دیں گے۔ پاکستانی حکمران امریکہ کے بوجھ تلے دبے نہ غزہ کا نام لیتے ہیں اور نہ کسی کو لینے دیتے ہیں۔ عوام اور دینی جماعتیں تھوڑی بہت حرکت کرتی ہیں لیکن ظاہر ہے اس سے حق ادا نہیں ہوتا اور نہیں ہو رہا۔

تعلیم و تربیت

پروفیسر بختیار حسین صدیقیؒ

امام غزالیؒ : کا تصورِ علم، تعلیم اور تزکیہ

حجۃ الاسلام ابو حامد محمد بن محمد الغزالی ۴۵۰ھ/ ۱۰۵۸ء میں طوس میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کپڑا کاتنے اور بیچنے کا کام کرتے تھے۔ عربی زبان میں غزل کے معنی کاتنے کے ہیں، اس لیے امام موصوف اپنے باپ کے پیشے کی نسبت سے غزالی مشہور ہوئے۔ تحقیق اور جستجو کا مادہ ان کی فطرت میں داخل تھا۔ حق و یقین کی راہ، ان کے نزدیک، شک کے خارزار سے ہو کر گزرتی ہے جب تک کسی کے دل میں شک و شبہے کا کانٹا نہیں چبھے گا یقین کی منزل تک اس کی رسائی اور بازیابی مشکل ہے۔ چنانچہ پہلے انہوں نے حواس کی شہادت پر شک کیا۔ پھر بدیہی امور بھی قابل اعتماد نہ رہے۔ آخر میں عقل پر سے بھی ان کا اعتبار اُٹھ گیا۔ نہ علم کلام کے مطالعہ سے ان کی تشفی ہوئی اور نہ فلسفے کے مطالعہ سے، تاآنکہ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ صحیح علم وہ ہے جہاں معلوم براہِ راست عالم کے سامنے موجود ہو اور ایسا علم صرف صوفیا کے پاس ہے۔ اس لیے انہوں نے تصوف کے دامن میں پناہ لی۔

تصورِ علم

غزالی نے علوم کو دو انواع میں تقسیم کیا ہے، ایک علم محمود دوسرا علم مذموم۔ پہلی نوع میں جملہ علوم آخرت اور دنیاوی علوم شامل ہیں۔ دوسری میں سحر، طلسمات سیمیا، کیمیا، اسرار الحروف وغیرہ شامل ہیں۔

علم محمود کی دو قسمیں ہیں: فرض عین اور فرض کفایہ۔ علم کے فرض ہونے سے مراد یہ ہے کہ انسان ان کاموں کے بارے میں تفصیل سے جان لے جو بالغ ہونے پر اسے پیش آنے والے ہیں۔ اگر کسی شخص نے یہ جان لیا کہ اس کے لیے کیا جاننا ضروری ہے اور کب جاننا ضروری ہے، تو وہ اس علم کی مقدار کو جان گیا جس کو حاصل کرنا اس کے لیے فرض عین ہے۔ قرآن و حدیث بنیادی علوم ہیں لیکن ان علوم کے تمام مسائل کا تعلق عمر کے ایک ہی حصے سے نہیں ہے۔ شرع کے احکام زندگی کے مختلف حصوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ انسان زندگی کے جس

حصے میں قدم رکھتا ہے، اس سے متعلق شرع کے احکام جاننا اس پر فرض ہے۔ علوم فی نفسہ سب ضروری ہیں، لیکن ضرورت کے مدارج کا تعین غزالی کے نزدیک ضروری ہے، جس سے ان کی مراد وہ اسباب ہیں جو کسی خاص علم کی اہمیت کو زیادہ اُجاگر کرتے ہیں۔ ان عوارض کا تعلق زمان ومکان کے تقاضوں سے ہوسکتا ہے، تمدنی اور ثقافتی حالات سے بھی اور نفسیاتی عوامل سے بھی۔

فرض کفایہ سے مراد وہ علوم ہیں جن کا حاصل کرنا دنیا کا کام چلانے کے لیے ضروری ہے مثلاً طب، ریاضی، صنعت وحرفت، زراعت، پارچہ بافی، خیاطی وغیرہ۔ ان علوم کی اہمیت یہ ہے کہ اگر پورے شہر میں ان کا جاننے والا کوئی نہ ہوتو کاروبار زندگی میں خلل پڑے گا اور اگر کچھ جاننے والے نکل آئیں تو کام چل جائے گا۔ اسی مناسبت سے انہیں فرض کفایہ کہا جاتا ہے۔

کفائی علوم کی دو انواع ہیں: علوم شرعیہ اور علوم دنیوی۔ پہلی نوع اصول (قرآن، آثار صحابہ، اجماع)، فروع، مقدمات اور متممات پر مشتمل ہے اور دوسری فقہ، طب، زراعت وغیرہ پر۔

علم کی شرط ایمان ہے

قرآن نے حواس اور عقل دونوں کو علمِ حق کا ذریعہ بتایا ہے۔ تو اس رنگ وبو کی محسوس دنیا کا علم عطا کرتے ہیں اور عقل مجرد تصورات کی غیر محسوس دنیا کا۔ حقیقت مطلق نہ مادی مفہوم میں محسوس ہے اور نہ غیر مادی مفہوم میں مجرد، اس لیے اس کا علم نہ ہمیں حواس سے حاصل ہوسکتا ہے اور نہ عقل سے۔ حقیقت مطلق کے علم کا سرچشمہ وحی ہے جس کا ہر شخص اہل نہیں ہوتا۔ خدا اپنے خاص بندوں کو وحی کے ذریعے اس کا علم عطا کرتا ہے۔ ان خاص بندوں کو پیغمبر کہتے ہیں۔ صرف پیغمبروں کو حقیقت مطلق کا براہ راست علم ہوتا ہے اور پھر وہ تبلیغ کے ذریعے اس علم کو دنیا میں پھیلاتے ہیں۔ جمہور عوام کا فرض ہے کہ وہ ان پر ایمان لائیں، نیک عمل کریں، تقویٰ کو اپنا شعار بنائیں اور حیا کو اپنی زینت۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''ایمان عریاں ہے۔ اس کا لباس تقویٰ ہے۔ اس کی زینت حیا ہے اور اس کا ثمرہ علم۔'' پس علم کی شرط ایمان ہے اور ایمان کا نتیجہ علم ہے۔ جس شخص کو پیغمبر کی تعلیم پر یقین ہو، وہ اس یقین کی بنیاد پر اپنی عقل کے مطابق حقیقت مطلق کا علم حاصل کرسکتا ہے۔ صرف اہل یقین کے لیے انفس میں خدا کی نشانیاں ہیں اور آفاق میں بھی۔ ان ہی لوگوں کو توحید کا نقش دل پر ثبت کرنے کے لیے قرآن نے فطرت کا

مشاہدہ کرنے اور مظاہر فطرت پر غور وفکر کرنے کی بار بار تاکید کی ہے۔عقل ایمان پر مبنی علم کی تائید کرسکتی ہے،اس کی تخلیق نہیں کرسکتی۔وہ صرف اس کی تفسیر اور تاویل پر قادر ہے۔اسلام کے معانی ہیں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت لیکن اسلام گونگی بہری اطاعت کا مطالبہ نہیں کرتا۔ مومن کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے دل ودماغ دونوں کو کام میں لائے۔دل کو عشق اور ذہن کو غور وفکر سے زندہ کرے۔کتاب وسنت پر عمل کرے اور انفس وآفاق میں خدا کی نشانیاں تلاش کرے۔کوئی بات سمجھ میں نہ آئے یا کسی بات کا علم نہ ہوتو سوال کرنے سے گریز نہ کرے۔ قرآن کا ارشاد ہے:"اگر تمہیں (کسی بات کا) علم نہیں ہے تو اہل ذکر وعلم سے پوچھ لو۔"

متعلمین کی درجہ بندی

حضرت علیؓ کا قول ہے"اے انسان علم مال سے بہتر ہے۔علم تیری حفاظت کرتا ہے اور تو مال کی۔علم حاکم ہے اور مال محکوم علیہ۔مال خرچ کرنے سے گھٹتا ہے اور علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔تاہم حصول علم کے وہی چار درجے ہیں جو مال ودولت کے حصول کے ہیں۔پہلے درجے میں انسان پیسہ کماتا ہے۔مال ودولت حاصل کرنے کے لیے تگ ودو کرتا ہے۔یہ اکتساب کا درجہ ہے۔دوسرے درجے میں وہ اپنی ضروریات سے زیادہ دولت کمالیتا ہے، زائد دولت کو جمع کرتا ہے،اس کی حفاظت کرتا ہے اور دوسروں کا دست نگر نہیں رہتا۔تیسرے درجے میں وہ اپنی دولت سے محظوظ ہوتا ہے اور اپنی ذات کے لیے آسائش وآرام کا سامان مہیا کرتا ہے یہ منتفع کا درجہ ہے۔چوتھے درجے میں وہ اپنی ذات کے علاوہ دوسروں پر بھی اپنی دولت خرچ کرنے لگتا ہے اور اس سے خوش ہوتا ہے۔یہ سخاوت وتفضّل کا درجہ ہے اور یہی درجہ سب سے افضل اور بہتر ہے۔

تحصیل علم کے بھی یہی چار درجات ہیں۔پہلے درجے میں متعلم دن رات علم حاصل کرنے میں لگا رہتا ہے اور سخت محنت وریاضت کرتا ہے۔یہ کسب وتحصیل کا درجہ ہے۔ دوسرے درجے میں وہ اتنا علم حاصل کرلیتا ہے کہ اس کی اپنی ضرورت رفع ہوجائے اور دوسروں سے بے نیاز ہوجائے۔تیسرا درجہ استبصار کا ہے۔اس منزل میں وہ اپنے حاصل کردہ علم پر غور وفکر کرتا ہے اور اس سے محظوظ ہوتا ہے۔چوتھا درجہ تبصیر کا ہے۔علم وبصیرت کی جو

روشنی اس نے حاصل کی ہے اب وہ اسے اپنے چاروں طرف پھیلاتا ہے۔ یہ تبلیغ کا درجہ ہے اور یہی سب سے اعلیٰ اور ارفع درجہ ہے۔اس کی مثال آفتاب کی سی ہے کہ خود بھی روشن ہے اور دنیا کو بھی روشنی بخشتا ہے۔ یا مشک کی سی ہے کہ خود بھی مہکتا ہے اور دوسروں کے مشام جان کو بھی معطر کرتا ہے۔

معلمین کے فرائض

اسلام کی رو سے معلم دراصل مبلغ ہے اور نبوت کے بعد تبلیغ سے بڑھ کر کوئی اعلیٰ وارفع منصب نہیں۔ اس منصب کی کچھ ذمہ داریاں ہیں جن کا لحاظ رکھنا معلم کے لیے ہر حال میں لازم ہے۔

۱۔ معلم کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے شاگردوں سے کمال محبت وشفقت سے پیش آئے۔ انہیں اپنا بیٹا تصور کرے۔ اس شفقت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ انہیں دنیا کی آگ کی بجائے آخرت کی آگ سے بچانے کی کوشش کرے۔ یہی وہ غایت عظمیٰ ہے جس کا حصول اسے والدین سے بھی زیادہ اعلیٰ اور ارفع مقام پر فائز کرتا ہے، کیونکہ والدین تو اولاد کو صرف ''حیات فانی'' کا خلعت بخشتے ہیں اور معلم انہیں 'حیات جاودانی'' سے سرفراز کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پس صحیح معنوں میں معلم وہی ہے جو اُخروی علوم کی تعلیم دے۔ دینوی علوم بھی اگر پڑھے تو اس غرض سے کہ یہ آخرت میں مفید ثابت ہوں۔

دنیائے اسلام میں غزالی پہلے مفکر نہیں ہیں جنھوں نے معلم کو والدین سے افضل اور برتر درجہ دیا ہو۔ ان سے پہلے ایک اور ایرانی مفکر ابوعلی احمد مسکویہ (۲۲۰۔۴۲۱/ ۹۳۲ ۔ ۱۰۳۰) نے استاد کو شاگرد کا ''روحانی باپ'' کہا ہے۔ والدین جسم کی پرورش کرتے ہیں۔ استاد روح کو سنوارتا اور نکھارتا ہے۔ روح چونکہ ایک اعلیٰ اور افضل جوہر ہے اس لیے اس کے سنوارنے والے کا مرتبہ جسم کی پرورش کرنے والے کے مرتبے سے بہرحال افضل اور برتر ہے۔

اسلام نے تعلیم کی بنیاد ڈر اور خوف کی بجائے محبت اور شفقت کے اصول پر رکھی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے ''میں تمہارے لیے اسی طرح شفیق و مشفق ہوں جس طرح ایک باپ اپنے بیٹے کے لیے ہوتا ہے۔'' اس کے برخلاف عیسائیت نے تعلیم کی بنیاد ڈر اور

خوف کے اصول پر رکھی۔اس کا عقیدہ ہے کہ چونکہ ''پہلا گناہ'' آدم سے سرزد ہوا تھا جس کی پاداش میں انہیں جنت سے نکلنا پڑا، اس لیے اس کے زیر اثر ہر بچہ ایک فطرتِ بدلے کر پیدا ہوتا ہے۔ وہ شیطان کا کارندہ ہوتا ہے۔ انسان کی تخلیق اگر برائی پر ہوئی ہے، تو بچے کو ان برے اثرات سے نجات دلانے کا صرف ایک طریقہ ہے کہ اس کی خوب ٹھکائی کی جائے۔'' مار سے بھوت بھاگتا ہے، تو پھر دماغ سے شیطنت کیوں نہ نکلے گی۔ چونکہ بچوں کو سخت سزائیں دینا عیسائی دنیا میں ایک معمول بن گیا۔''ڈنڈا چھوڑا اور بچہ بگڑا'' ایک کہاوت بن گئی۔ پسٹالوزی (۱۷۷٦۔۱۸۲۷ء) پہلا شخص ہے جس نے بچے کو عیسائیت کے ظلم وستم سے نجات دلائی اور ڈر اور خوف کے مقابلے میں محبت کی تعلیمی اہمیت کو اُجاگر کیا۔ محبت انسانی نشوونما کا بنیادی اصول ہے۔ فرد اور معاشرے دونوں کا ارتقا محبت کی فراوانی پر موقوف ہے۔ والدین، اقربا اور اساتذہ کی محبت بچے کی تمام جسمانی اور روحانی نمو کا سرچشمہ ہے۔

۲۔ دوسری بات جس کا لحاظ رکھنا معلم کے لیے لازم ہے وہ یہ کہ وہ متعلم کے ذہن میں حسب ذیل تین باتیں اچھی طرح بٹھائے تاکہ تحصیلِ علم کی راہ میں وہ صحیح سمت میں قدم آگے بڑھائے:

الف۔ جب تک کسی خاص علم کو حاصل کرنے کی استعداد اس میں پیدا نہ ہو جائے وہ اس کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے۔

ب۔ وہ علوم ظاہر پر عبور حاصل کیے بغیر علوم باطن کی طرف توجہ نہ دے۔

ج۔ وہ جو علم بھی حاصل کرے اس کی غرض وغایت اللہ کا تقرب حاصل کرنا ہو۔ وہ علوم آخرت کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے۔ دنیاوی علوم بھی حاصل کرے تو اس نیت سے کہ یہ آخرت میں اس کے لیے مفید ثابت ہوں۔

۳۔ معلم کو چاہیے کہ وہ درس وتدریس کے روحانی مشغلے کا کوئی مادی اجر وصلہ نہ طلب کرے۔ اوّل مال ودولت اس کا معاوضہ ہی کب ہوسکتا ہے؟ دوسرے اجروثواب تو اسے ملا ہے کہ تبلیغ کا شرف اسے حاصل ہوا ہے۔ پھر اس کا صلہ کیسا؟ اس کا صلہ تو اللہ کا تقرب ہے اور اس سے بڑھ کر اور کوئی صلہ نہیں ہوسکتا۔

معلم کا اپنی محنت کا معاوضہ نہ طلب کرنے کا تصور ہمیں فرانسیسی مفکر ژاں ژاک روسو (۱۷۱۲ـ۱۷۷۸ء) نے دیا۔ ای میل (emile) کے اتالیق کے لیے جو شرائط اس نے تجویز کی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے کام کا معاوضہ نہ طلب کرے۔ یہ اس کے شایانِ شان نہیں بلکہ اس کے منصب کی اہمیت اور عظمت کے سراسر منافی ہے۔

۴۔ معلم کے لیے لازم ہے کہ اگر شاگرد سے کوئی اخلاقی لغزش سرزد ہو جائے تو وہ کنائے اور اشارے سے اسے اپنی غلطی کا احساس دلائے۔ علانیہ اس پر گرفت نہ کرے اور نہ ڈانٹ ڈپٹ سے کام لے، کیونکہ اس طرح دل سے خوف وڈر نکل جاتا ہے اور وہ اپنی غلطی پر نادم ہونے کے بجائے الٹا اس پر دلیر ہو جاتا ہے۔ اس میں جو نفسیاتی نکتہ مضمر ہے وہ یہ ہے کہ جس کام سے انسان کو منع کیا جائے وہ اس کے کرنے پر اور آمادہ ہوتا ہے۔ اشارے اور کنائے کا طریقہ اختیار کرنے میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ غور وفکر کی قوت کو مہمیز کرتا ہے اور غیرت وحمیت کے ابھارنے والے جو دقیق معنی اس میں پوشیدہ ہوتے ہیں، اسے معلوم کر کے شاگرد کو بے حد خوشی ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر خوشی تو اسے اس بات سے ہوتی ہے کہ استاد نے اس کی ذہانت اور فطانت کا پورا پورا پاس رکھا ہے۔

غزالی کا پیشرو مسکویہ بھی سب کے سامنے بچے کی توجہ اس کی لغزش کی طرف دلانے اور اسے لعنت وملامت کرنے سے منع کرتا ہے، کیونکہ اس سے اس کی فطری راست بازی کو نقصان پہنچتا ہے اور وہ جہل، مکر اور فریب کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ بچے کی غلطی پر شروع میں چشم پوشی کی جائے، پھر کنائے اور اشارے سے اسے سمجھایا جائے۔ اور اگر سزا دینی ضروری ہی ہو جائے تو پھر تنہائی میں اسے سرزنش کی جائے، سب کے سامنے اسے نہ ڈانٹا جائے تاکہ وہ سزا کو اپنی غلطی کا منطقی خمیازہ سمجھے اور آئندہ اس کا مرتکب نہ ہو۔

۵۔ اساتذہ میں ایک عام کمزوری یہ ہوتی ہے کہ جو مضامین وہ نہیں پڑھاتے، ان کی اپنے شاگردوں کے سامنے مذمت کرتے ہیں مثلاً جو استاد لغت وادب کا درس دیتا ہے وہ فقہ کی تحقیر کرتا ہے۔ جو فقہ پڑھاتا ہے وہ کلام کی مذمت کرتا ہے۔ علمی نقطۂ نظر سے یہ بہت بری بات ہے۔ استاد کے لیے لازم ہے کہ وہ ایسی باتوں سے پرہیز کرے اور نہ صرف اس مضمون کی جو وہ خود پڑھاتا ہے، بلکہ دوسرے تمام مضامین کی اہمیت، قدر وقیمت اور عظمت شاگرد کے دل

میں بڑھانے کی کوشش کرے تاکہ وہ ہر مضمون کو پورے ذوق وشوق کے ساتھ پڑھے، خواہ وہ خالصتاً دنیاوی مضمون کیوں نہ ہو۔

۶۔ استاد کے لیے لازم ہے کہ اسے شاگرد کی اہلیت اور ذہنی استعداد کا پورا پورا علم ہو اور وہ اسے صرف وہی بات بتائے جو اس کی عقل وفہم کی گرفت میں آسکے۔ ہر شخص کی ذہنی استعداد ایک جیسی نہیں ہوتی، اس لیے ہر حقیقت کا اظہار ہر شخص کے سامنے نہیں کرنا چاہیے۔ یہ نہ صرف وقت اور محنت کا ضیاع ہے، بلکہ اس سے فساد پھیلنے کا بھی اندیشہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے ہم گروہِ انبیاء کو حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں کو ان کی صحیح جگہوں پر رکھیں اور ان کی عقلی حیثیت کے مطابق ان سے بات چیت کریں۔

۷۔ جس شاگرد کی ذہنی سطح نہایت پست ہو، اسے دینی اور دنیاوی علوم کی صرف موٹی موٹی باتیں بتائی جائیں لیکن اس سے یہ ہرگز نہ کہا جائے کہ ان بنیادی باتوں کے پیچھے دقیق اور باریک باتیں بھی ہیں۔ اس کا اس کے ذہن پر خراب اثر پڑے گا۔ وہ سمجھے گا کہ استاد اس کے ساتھ بخل سے کام لے رہا ہے، کیونکہ ہر شخص کو اپنی عقل وفہم کے متعلق بڑی خوش فہمی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام غزالی نے خواص وعوام کے لیے علیحدہ علیحدہ کتابیں لکھیں۔

ذہانت کے اعتبار سے طلباء میں انفرادی اختلافات کا یہ اعتراف اور ان کی ذہنی استعداد کے مطابق انہیں تعلیم دینے پر یہ اصرار ہمیں بے اختیار پسٹالوزی (۱۷۷۶ـ۱۸۲۷ء) کی یاد دلاتا ہے جس کے فطرت کے راستے پر چلنے کے اصول نے بیسویں صدی میں ''بچے پر مرکوز تعلیم'' اور ترقی پسند تعلیم کو جنم دیا۔

۸۔ معلم کے لیے لازم ہے کہ وہ ابتدائی مراحل میں طلباء کو بحث ومناظرے سے دور رکھے۔ اس سے عقائد کی اتنی اصلاح نہیں ہوتی جتنا کہ فساد اور بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ فریقین کو اعتراف حق کی توفیق نہیں ہوتی، بلکہ ذہنی تعصب کی بنا پر بحث برائے بحث کیے جاتے ہیں۔ تعلیم کے آخری مراحل میں غزالی بادل ناخواستہ بحث ومناظرے کی اجازت دیتے ہیں بشرطیکہ وہ ان آٹھ شرائط پر پورا اُترے جو انہوں نے اس کے لیے مقرر کی ہیں۔ شاید یہ غزالی ہی کی تعلیم کا اثر تھا کہ ڈھائی سو سال بعد ابن خلدون کو کہنا پڑا '' آج ہمارے زمانے میں تعلیم کا

رنگ ہی دوسرا ہے۔شاگرد برسوں اور سالوں مجالس علمیہ میں بیٹھتے ہیں،مگر گم صم، نہ بولتے ہیں، نہ بحثیں کرتے ہیں اور نہ مناظروں میں حصہ لیتے ہیں۔ان کی تمام تر توجہ مسائل علمیہ یاد کرنے پر لگی ہوتی ہے۔لہٰذا ان کی اس فقۂ عملی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ علم میں ان کو ملکہ حاصل نہیں ہوتا۔ابن خلدون کے نزدیک کسی مضمون میں ملکہ حاصل کرنے کے لیے لازم ہے کہ طلباء کو بحث ومناظرے کا عادی بنایا جائے۔مسائل علمیہ پر تحقیقی بحثیں ہوں۔مختلف مضامین پر گفتگو چھڑے اور طلبا اس میں سرگرمی سے حصہ لیں۔

۹۔ استاد شاگرد کے لیے مجسم حقیقت ہوتا ہے۔اس کے لیے صرف یہی ضروری نہیں کہ وہ اپنے علم پر عبور رکھتا ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اس پر عمل کرتا ہو۔اسے عالم باعمل ہونا چاہیے۔اس کے قول وفعل میں تضاد ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ورنہ شاگرد اس سے کچھ سیکھ نہیں سکتا۔استاد کی بات میں اثر اس وقت ہوتا ہے جب وہ ''گفتار کا غازی'' ہونے کے ساتھ ساتھ ''کردار کا غازی'' بھی ہو۔

۱۰۔ روشن ضمیری اور باطن کی صفائی معلم کی بنیادی خصوصیت ہے۔لیکن اس کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ اپنے ظاہری لباس کو بھی صاف ستھرا رکھے،تاکہ طلبا کی نگاہوں میں عزت وتوقیر پیدا ہو اور وہ کسی لحاظ سے بھی اس کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں۔جو شخص بھی دعوت الیٰ اللہ کا بیڑا اٹھائے گا،اس کا فرض ہے کہ وہ بھی اسی قصد اور اسی نیت سے اپنے ظاہر کی صفائی اور ستھرائی پر خاص توجہ دے،تاکہ لوگوں کی نفرت اور بے وقعتی کی نگاہوں کا ہدف نہ بنے۔

متعلمین کے فرائض

استاد اور شاگرد کے درمیان جو رشتہ ہے اس کی نوعیت خالصتاً روحانی ہے۔استاد کی جملہ کوششوں کا ہدف شاگرد کے نفس کی تربیت اور اصلاح ہے تاکہ وہ روحانی تمول کے اس مقام پر فائز ہو جائے جو تعلیم کا منتہائے مقصود ہے۔اس منزل تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ شاگرد حسب ذیل شرائط کی پابندی کرے:

۱۔ متعلم کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کو اخلاقی برائیوں سے پاک کرے۔جس طرح وضو کے بغیر نماز جائز نہیں،اسی طرح قلب کو پاک کیے بغیر حصول علم ممکن نہیں۔دین کی بنیاد طہارت ونظافت پر رکھی گئی ہے جو قلب کے لیے بھی اتنی ہی ضروری ہے

جتنی کہ جسم کے لیے۔ پس علم وہی شخص حاصل کر سکتا ہے جس کا دل پاک اور باطن صاف ہو۔

۲۔ انسان ایک وقت میں دو چیزوں کی طرف توجہ نہیں دے سکتا۔ اس لیے متعلم کے لیے لازم ہے کہ وہ دنیوی علائق سے اپنے آپ کو الگ رکھے اور گھر بار اور وطن سے دور ہی رہے، تا کہ یک سوئی کے ساتھ وہ علم حاصل کر سکے۔ اس کے برخلاف روسو متعلم کو سرے سے معاشرے ہی سے الگ رکھنے پر زور دیتا ہے۔ اس کے نزدیک بچہ فطرتاً نیک ہے، وہ برائی معاشرے سے سیکھتا ہے۔ اس لیے تعلیم کی بیس سالہ مدت کے دوران میں اسے معاشرے سے دور رکھنا ہی بہتر ہے، ایسی جگہ جہاں صرف شاگرد ہو اور اس کا استاد اور بس۔

۳۔ متعلم کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے استاد کی تعظیم و تکریم میں ہرگز کوتاہی نہ کرے۔ علم روحانی ارتباط سے حاصل ہوتا ہے اور استاد کا ادب واحترام اس ارتباط کی لازمی شرط ہے۔ پس شاگرد کو چاہیے کہ وہ تواضع کو اپنا شعار بنائے اور عقیدت اور توجہ کے ساتھ استاد کا درس سنے۔

۴۔ سوال علم کی کنجی ہے۔ اس لیے متعلم کے لیے لازم ہے کہ جو بات اس کی سمجھ میں نہ آئے استاد سے ضرور پوچھ لے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ سوال استاد کی اجازت سے کیا جائے اور اس مرحلے پر کیا جائے جس کا استاد نے پہلے سے تعین کر دیا ہے۔ سوال کب کرنا چاہیے؟ متعلم کی ذہنی سطح کن سوالات کی متحمل ہے؟ ان شرائط کا لحاظ رکھا جائے تو سوال علم کی کنجی ہے۔ انہیں نظر انداز کر دیا جائے تو سوال ایک مذموم حرکت ہے۔

۵۔ قوت فہم رفتہ رفتہ ترقی کرتی ہے۔ اس لیے شاگرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ شروع میں اپنی توجہ علوم کی اساسیات اور مسلمات تک محدود رکھے۔ استاد جو کچھ پڑھائے، اسے ذہن نشین کرے، اس سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرے۔ بالخصوص نزاعی امور اور اختلافی مسائل میں نہ الجھے۔ اگر وہ ان میں الجھ گیا تو ذہن پراگندہ و پریشان ہوگا اور وہ ان کی تہہ تک نہ پہنچ سکے گا۔

۶۔ علم ایک ناپیدا کنار سمندر ہے۔ اس لیے متعلم کے لیے لازم ہے کہ کسی علم کی تحصیل کا فیصلہ کرنے سے پیشتر یہ دیکھ لے کہ اس علم کی اپنی قدر و قیمت کیا ہے اور یہ کہ اس کی عمر اتنی ہے کہ اس مدت میں وہ اس پر عبور حاصل کر لے۔ اگر علم کی اہمیت اور عمر دونوں اس بات کی

اجازت نہیں دیتے کہ اس علم کو حاصل کیا جائے، تو پھر اس میں دلچسپی نہ لے، بلکہ کسی اور علم کی تحصیل میں لگ جائے جو اس سے زیادہ اہم ہو اور جسے اس حیات فانی میں آسانی سے حاصل کیا جاسکے۔

۷۔ ہر علم کی اہمیت یکساں نہیں ہوتی۔ بعض علوم بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، بعض فروعی۔ بعض علوم آخرت کو سنوارتے ہیں، بعض دنیا کو۔ غرض وغایت کے اعتبار سے علوم کی جو ترتیب ہے، متعلم کو ہر حال میں اس کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ جو علم اہم ہے اسے سب سے پہلے حاصل کرنا چاہیے۔ پھر اس سے کم اہم علم کی طرف توجہ دینی چاہیے، علیٰ ہذا القیاس۔ اس کے لیے لازم ہے کہ وہ پہلے علوم آخرت کی طرف توجہ دے، کیونکہ یہی علوم غرض وغایت کے اعتبار سے اعلیٰ، اشرف اور اہم ہیں اور ان میں بھی پہلے وہ علوم حاصل کرے جو نسبتاً آسان ہوں۔ علوم آخرت کے بعد دنیاوی علوم کی طرف توجہ دے۔

۸۔ علوم وفنون آپس میں ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ ان میں ایک طرح کی ترتیب وتدریج پائی جاتی ہے۔ ایک سے دوسرے کی طرف راہ نکلتی ہے۔ اس لیے متعلم کے لیے لازم ہے کہ جب تک وہ نیچے کے علم میں مہارت حاصل نہ کرلے، اوپر کے علم کی طرف بڑھنے کی کوشش نہ کرے۔

* امام غزالیؒ پہلے مسلمان مفکر ہیں جنہوں نے نصاب تعلیم کو لازمی اور اختیاری مضامین کے تصور سے آشنا کیا اور مضامین کی ضرورت اور اہمیت کے اعتبار سے نصاب میں انہیں جگہ دی۔ ذہانت کے اعتبار سے انہوں نے طلبا میں انفرادی اختلافات کو بھی تسلیم کیا اور ان کی ذہنی استعداد کے مطابق انہیں تعلیم دینے پر زور دیا اور خود بھی خواص وعوام کے لیے علیحدہ علیحدہ کتابیں لکھیں۔

مبلغین کی درجہ بندی

علم کی اصل غایت لوگوں کی اصلاح اور ہدایت ہے اور یہ مقصد اس صورت میں پورا ہوسکتا ہے جب علماء کی ایک ایسی مستقل جماعت موجود ہو جو لوگوں میں علم پھیلائے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اب کوئی پیغمبر ہماری ہدایت کے لیے نہیں آئے گا۔ یہ کام اب علماء کا ہے وہ دین

کے علم کو لوگوں میں پھیلائیں۔ اس کے فیوض کو عام کریں۔ تبلیغ کا فرض کماحقہ ادا کریں۔ وہ انبیاء کے وارث ہیں۔ ان کی حیثیت ایک مبلغ کی ہے اور تبلیغ ان کا مقدس فرض۔

غزالی کے نزدیک مبلغین کے چار درجے ہیں۔ پہلا درجہ انبیاء کا ہے۔ یہ سب سے اعلیٰ منصب اور اونچا درجہ ہے۔ انبیاء پر وحی نازل ہوتی ہے۔ وہ براہ راست اللہ تعالیٰ سے علم حاصل کرتے ہیں اور اسے لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ دوسرا درجہ خلفا وسلاطین کا ہے۔ انبیاء باطن کو سنوارتے ہیں۔ نفس کا تزکیہ کرتے ہیں اور دلوں کو پاک کرتے ہیں۔ خلفا وسلاطین کے اختیار میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ لوگوں کی ظاہری حالت کی اصلاح کریں۔ خارجی حیثیت سے شریعت کی پابندی پر زور دیں۔ عدل وانصاف کی بنیاد پر معاشرے کی تنظیم کریں اور ظلم وناانصافی کو بزور شمشیر روکیں۔ تیسرا درجہ علمائے ربانی کا ہے جن سے صرف خاص خاص لوگ مستفید ہوتے ہیں۔ ان کا مقصود عوام کی فلاح نہیں ہوتا بلکہ ان چند اعلیٰ نفوس کی اصلاح ہوتا ہے جن کی ذہنی سطح عام ذہنی سطح سے بلند ہو۔ اپنی صحبت، تربیت اور توجہ کے فیض سے وہ ان منفرد اشخاص کو اس لائق بنا دیتے ہیں کہ خلق خدا ان سے فائدہ اٹھا سکے۔ چوتھا درجہ عام علماء اور واعظین قوم کا ہے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ جمہور عوام کو کتاب وسنت کی تعلیم دیں۔ ان کے ظاہر اور باطن کی تربیت کا اہتمام کریں۔ دین کے علم کو دور دور تک پہنچائیں۔ تبلیغ کا فرض انجام دینے میں کوئی کوتاہی نہ کریں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو قومی طاقت کا ستون ہیں۔ ان ہی کے متعلق رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ وہ انبیاء کے وارث ہیں۔ اور عبداللہ ابن المبارک کا قول ہے کہ وہ انسان ہیں، کیونکہ علم ہی کی وجہ سے انسان کو حیوانوں اور فرشتوں پر فضیلت حاصل ہے۔ نبوت کے بعد تبلیغ سے بڑھ کر کوئی اعلیٰ وارفع منصب نہیں۔

تربیت/تزکیۂ نفس کا دس نکاتی پروگرام

[امام غزالیؒ پر جب اصلاح نفس اور تربیت وتزکیہ کا جوش غالب ہوا تو انہوں نے ملازمت] اہل وعیال اور دوست واحباب کو چھوڑ کر شام کا رخ کیا اور دس سال گوشہ نشین رہے۔ اس عرصے میں انہوں نے تصفیۂ قلب کے لیے ایک دس نکاتی پروگرام پر عمل کیا جس کی تفصیل رسالۂ لدنیہ میں موجود ہے۔

۱۔ سالک کو چاہیے کہ وہ اپنی نیت ہمیشہ درست اور صحیح رکھے اور اس میں کبھی کسی موقع پر فتور یا خلل نہ آنے دے۔

۲۔ اسے پوری یک سوئی اور دلجمعی کے ساتھ اللہ کی اطاعت اور بندگی کرنی چاہیے۔

۳۔ اس کے تمام اعمال کو زہد وتقویٰ کے معیار پر پورا اُترنا چاہیے۔

۴۔ اس کے دل میں اپنی منزل تک پہنچنے کی لگن ہونی چاہیے۔ ذوق وشوق کے بغیر یہ راستہ ہرگز نہیں طے کیا جا سکتا۔

۵۔ اسے ہر حالت میں شریعت کی پابندی کرنی اور بدعت سے احتراز کرنا چاہیے۔

۶۔ اسے بندگانِ خدا کے ساتھ عاجزی اور انکساری کے ساتھ پیش آنا چاہیے کہ جملہ مخلوق خدا کی محتاج ہے۔

۷۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اگرچہ انسان کی نجات کا دارومدار ایمان محکم پر ہے، تاہم حقیقی خوف اور امید اس کے دائرے سے باہر نہیں۔

۸۔ عبادت وریاضت، مجاہدہ وتزکیۂ نفس اس کا شیوہ ہونا چاہیے۔

۹۔ اسے ہمیشہ اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ غیر اللہ کا خیال اس کے دل میں نہ آنے پائے۔

۱۰۔ اسے اپنے اندر وہ نظر اور بصیرت پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جو اسے دیدار خدا کی منزل مقصود تک پہنچا دے۔

۵۰۵ھ/ ۱۱۱۱ء میں غزالی نے اپنے آبائی گاؤں طابران میں وفات پائی۔ ابن جوزی نے ان کی وفات کا قصہ اس طرح بیان کیا ہے کہ پیر کے دن امام صاحب صبح کے وقت بستر خواب سے اٹھے۔ وضو کر کے نماز پڑھی، پھر کفن منگوایا اور آنکھوں سے لگا کر کہا'' آقا کا حکم سر آنکھوں پر'' یہ کہہ کر پاؤں پھیلا دیے۔ لوگوں نے دیکھا تو دم نکل چکا تھا۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

تعلیم و تربیت

پروفیسر عاصم حفیظ

پنجاب کے کالجوں میں مخلوط تعلیم کی بھرمار

گرلز کالجز خالی کر کے بوائز کالجز میں دھڑا دھڑ ٹرانسفرز

خواتین پروفیسرز گرلز کالجز میں رہنا نہیں چاہتیں

لڑکوں کے لیے ختم ہوتے تعلیم و روزگار کے مواقع۔لمحہ فکریہ

پنجاب کے سرکاری کالجز ان دنوں شدید بحران کا شکار ہیں۔ایک محکمانہ پالیسی کے تحت بوائز کالجز کو مخلوط قرار دیا گیا۔خواتین پروفیسرز کو سینکڑوں کی تعداد میں بوائز کالجز ٹرانسفر کیا گیا۔ گرلز کالج ٹیچرز سے خالی ہوئے۔وہاں نئے پروگرامز شروع نہ ہو سکے تو گرلز نے داخلوں کے لیے انہی بوائز کالجز کا رخ کیا۔اور اس وقت صورت حال یہ ہے کہ بوائز کالجز میں بی ایس لیول پر 70 سے فیصد 80 گرلز پڑھ رہی ہیں۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پنجاب بھر میں بوائز کالجز کی تعداد پہلے ہی کم 377 اور گرلز کالجز کی 448 تھی۔پھر پالیسی بنی تو اس وقت صورت حال یہ ہے کہ گرلز 607 کالجز میں داخلہ لے سکتی ہیں اور بوائز کے لیے صرف 222 بوائز کالجز اور 155 مخلوط کالجز دستیاب ہیں۔

کچھ عرصہ قبل کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق لاہور ڈویژن کے کالجز میں زیر تعلیم گرلز کی تعداد 26000 سے زیادہ ہے۔شنید یہ ہے کہ یہ بوائز کالجز میں پڑھ رہی ہیں یعنی 87 ہزار کے مقابلے میں 61 ہزار۔کئی بوائز کالجز میں دو ہزار سے زائد طالبات بی ایس لیول پر زیر تعلیم ہیں۔

اس وقت بوائز کالجز کی 1500 سے زائد سیٹوں پر خواتین تعینات ہیں جبکہ گرلز کی تعداد بی ایس لیول پر ستر فیصد سے زائد ہے۔ان دنوں ایک بار پھر ٹرانسفرز ہو رہی ہیں تو بوائز کالجز میں ایک ایک سیٹ پر دس سے بارہ خواتین اپلائی کر چکی ہیں۔یہ بھی دیکھا گیا کہ بوائز اور گرلز کالج کی دیوار سانجھی ہے یا بالکل قریب قریب ہے۔ایک ہی شہر ہو تو وہاں بھی خواتین پروفیسرز گرلز کالج سے بوائز کالج میں ٹرانسفر کرا رہی ہیں۔

اسی کا ایک دوسرا رخ بھرتیوں میں سامنے آتا ہے۔ کیونکہ بھرتی الگ الگ کیڈر میں ہوتی ہے۔

پنجاب پبلک سروس کمیشن کی حالیہ بھرتی میں 1359 خواتین اور صرف 372 مرد لیکچررز کو بھرتی کیا گیا یعنی 73 فیصد خواتین اور 27 فیصد مرد آسامیاں۔ اس سے پہلے آنے والی بھرتیوں میں بھی 2691 خواتین اور 732 مرد لیکچررز کو بھرتی کیا گیا۔ یعنی 79 فیصد خواتین اور 21 فیصد مرد آسامیاں۔ یعنی ہر پانچ لیکچررز کی بھرتی میں چار خواتین اور صرف ایک مرد کو بھرتی کیا جا رہا ہے۔

کچھ احباب پرجوش انداز میں اسے ''لڑکیوں کے لئے تعلیم کے مواقع'' کے نام پر بڑا کارنامہ دے کر خوب حمایت کرتے ہیں۔ لیکن اگر غور کریں تو اس سے تو خواتین کے لئے سہولیات اور اور مواقع میں اضافے کی بجائے انہیں محروم رکھا گیا۔ آپ اس پالیسی کا اندازہ اس سے لگائیں کہ بوائز کالجز میں تو بی ایس کلاسز شروع ہوئیں، ایوننگ پروگرامز بھی شروع کئے گئے لیکن انہی کے قریب موجود گرلز کالجز کو اپ گریڈ نہیں کیا گیا۔ یعنی گرلز کالجز اپ گریڈیشن، نئی کلاسز کے اجراء، نئے پروگرامز شروع کرنے سے محروم رکھے گئے اور ان طالبات کو بوائز کالجز میں داخلے پر مجبور ہونا پڑا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ گرلز کالجز کو بھی اپ گریڈ کیا جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اسی طرح نئے بوائز کالجز کے قیام کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔

اسی کا ایک پہلو حالیہ ٹرانسفر پالیسی میں سامنے آیا کہ ترقی پانے والے 454 مرد پروفیسرز کو دور دراز ٹرانسفر کر دیا گیا کیونکہ بوائز کالجز میں ان کی سیٹوں پر خواتین تعینات تھیں۔ یہ 455 گھرانے شدید مشکلات اور بہت سے دور دراز نقل مکانی پر مجبور ہوئے ہیں۔

صوبہ بھر میں بوائز کالجز مخلوط ہو جانے کے باعث وہاں کی سینکڑوں سیٹوں پر خواتین پروفیسرز تعینات ہیں اس سے چھوٹے شہروں میں تعینات مرد پروفیسرز جو کہ ٹرانسفر کے خواہشمند ہیں ان کے لئے سیٹیں موجود نہیں۔ اس ''پالیسی'' کے تحت ہی اب بھرتیوں میں بوائز کالجز کی سیٹیں تو بھری ہوئی ہیں اس لئے نئی بھرتی کی ضرورت نہیں۔ یعنی عجیب وغریب

پلاننگ یہ ہے کہ ٹرانسفرز تو مخلوط کالجز میں ہوسکتی ہے لیکن بھرتی کے موقعے پر الگ الگ سیٹیں اناؤنس کی جاتی ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مخلوط کالجز میں خواتین کو '' With Seat یا Create New Seat '' کے تحت تعینات کیا جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا ہے۔ مانا کہ وہاں لڑکیوں کے داخلے کے باعث ان کی تعیناتی کا جواز موجود ہے لیکن اس سے کئی پروفیشنل پیچیدگیاں بھی پیدا ہوئی ہیں۔خواتین کو ضرور ملازمتیں دیں، گرلز کالجز بنائیں، وہاں نئے بلاک بنائیں، نئے کورسز شروع کریں، ان کی تعداد بڑھائیں لیکن مردوں کے لئے دستیاب مواقع تو نہ کم کریں۔ جب آبادی میں توازن برابر ہے تو کم سے کم برابر کے مواقع تو دیئے جائیں۔ اگر سیٹیں ہی اسی فیصد بمقابلہ بیس کے تناسب سے مشتہر کی جائیں گی تو ملازمتوں میں بھی تو عدم توازن ہی پیدا ہوگا۔

قومی پیداوار اور ترقی کے حوالے سے دیکھیں تو یہ کیسی پالیسی ہے کہ ایک گھر کی لڑکی کو تو پڑھا دیا جائے، ملازمت کے مواقع بھی ہوں جبکہ لڑکے کے لئے چانس ہی کئی گنا محدود کر دیئے جائیں۔

اربابِ اختیار اور پالیسی سازوں کو اس ساری صورتحال کو انتہائی سنجیدگی سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ایک سخت اور جابرانہ پالیسی کے تحت بوائز کے لئے تعلیم اور متوسط و لوئر مڈل کلاس کے پڑھے لکھے نوجوانوں کے لئے تعلیم و روزگار کے مواقع انتہائی محدود کر دینا کہاں کی عقلمندی ہے؟ یقین مانیں یہ کوئی مرد و خواتین کے مقابلے اور حقوق کی جنگ کا معاملہ نہیں ہے، یہ ایک متوازن سوسائٹی کے قیام کا مسئلہ ہے۔ اگر ہم تعلیم و روزگار کی سہولیات کو آبادی کے تناسب سے فراہم نہیں کریں گے، پالیسی کے زور پر مواقع تین گنا محدود کر دیئے جائیں گے تو اس سے معاشرے کا توازن بگڑے گا جس سے خاندانی، سماجی نظام میں دیگر کئی مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ اگر ایک متوازن قومی پیداوار اور ترقی کا حصول ہمارا مقصد ہے تو پھر اس صورت حال پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔

تفہیم دین

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

عمرہ اور حج پر جانے والی خواتین و حضرات توجہ فرمائیں
حرم مکی اور مدنی کی انتظامیہ کی خدمت میں چند گزارشات

ہم اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہیں کہ وہ ہر کچھ عرصہ بعد ہمیں اپنے گھر کی زیارت کا شرف بخشتے ہیں چنانچہ اگست ۲۰۲۴ء کے آخری ہفتے میں چند دن کے لیے عمرہ کا اچانک پروگرام بن گیا اور حرم مکی و مدنی دونوں میں کچھ لمحے گزارنے کا موقع مل گیا۔ اس دفعہ اپنے چند تاثرات عازمینِ حرم اور منتظمین حرم کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں جس سے تنقید نہیں محض اصلاح مقصود ہے۔

موبائل فون کا مرضِ مزمن

آپ خضوع وخشوع سے کعبۂ معظّمہ کا طواف کرنا چاہتے ہوں یا ریاض الجنۃ میں سکون واطمینان سے نوافل ادا کرنا چاہتے ہوں، یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ادب واحترام سے سلام پیش کرنا چاہتے ہوں اب یہ ممکن ہی نہیں۔ موبائل فون کے غلط استعمال کی ہڑبونگ آپ کو کچھ بھی اطمینان سے نہیں کرنے دے گی۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے یوں لگتا ہے کہ ۸۰، ۹۰ فیصد لوگ محض فوٹوگرافی کے لیے ارض مقدس جاتے ہیں۔ ہر آدمی اپنا موبائل فون بلند کیے ہوئے تصویر کشی میں مصروف ہے، وڈیو کالیں چل رہی ہیں، لائیو کمنٹری جاری ہے، سیلفی پہ سیلفی لی جارہی ہے۔ اتنی کوفت ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ سکون اور دل جمعی سے عبادت کا کوئی تصور ہی نہیں رہا۔ موبائل فون، فون اور فون۔

ہم زائرین کی خدمت میں دست بستہ عرض کرتے ہیں کہ حرمین شریفین میں موبائل فون کو سیلفیوں اور فوٹوگرافی کے لیے ہرگز استعمال نہ کریں۔ ہم حرمین کی انتظامیہ سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ وہ حرمین میں موبائل فون پر پابندی لگادے یا تصویر کشی کی ممانعت کردے۔ اس کی سارے عالم اسلام میں وسیع پیمانے پر تشہیر کی جائے۔ حج پر جانے والوں کی تربیت گاہوں میں اس مسئلے کو اٹھایا جائے اور ہر ممکن اقدام کیا جائے کہ زائرین سکون واطمینان سے اور خضوع وخشوع سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں نہ کہ ان قیمتی لمحات کو فوٹوگرافی کی نذر کریں۔

حرم مکی میں اختلاط مرد وزن

آپ اگر حرم مدنی جائیں تو وہاں اختلاطِ مرد وزن کہیں نظر نہیں آتا۔ مسجد نبوی میں عورتوں کی نماز کا ایریا الگ ہے، آنے جانے کے دروازے الگ ہیں۔ ان کے لیے ریاض الجنۃ میں جانے اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر درود وسلام بھیجنے کے اوقات اور راستے مردوں سے الگ ہیں لہٰذا مسجد نبوی میں اختلاط سے کسی کو پالا نہیں پڑتا۔ حرم مکی کا معاملہ مگر اس سے قطعی مختلف ہے۔ یہاں حرم میں داخلے کے راستے یکساں ہیں۔ اندر برقی سیڑھیوں پر اُترنے چڑھنے کے راستے بھی عورتوں مردوں کے لیے یکساں ہیں اور بعض اوقات رش میں ہزاروں مرد وخواتین گتھم گتھا ہو رہے ہوتے ہیں۔ طواف میں بھی یہ اختلاط جاری رہتا ہے۔ مطاف میں نماز پڑھنے کی جگہ اگرچہ عورتوں کے لیے الگ مختص ہوتی ہے لیکن نماز اور طواف کے لیے آنے جانے کے راستے چونکہ یکساں ہیں لہٰذا اختلاط سے بچنا اور عورتوں مردوں میں دھکم پیل سے بچنا ممکن نہیں رہتا۔ ہمارا سوال حرم مکی کی انتظامیہ سے یہ ہے کہ اگر حرم مدنی میں اختلاط مرد وزن سے بچا جا سکتا ہے تو حرم مکی میں یہ کیوں ممکن نہیں؟ خواتین کے حرم میں آنے جانے کے دروازے اور راستے الگ متعین کیے جا سکتے ہیں اور طواف کے لیے ان کا الگ وقت مخصوص کیا جا سکتا ہے۔ حرم مکی کی انتظامیہ نے اگر پہلے اس پر غور نہیں کیا تو اب کر لے۔

عورتوں کی بے پردگی کا مسئلہ

عصر حاضر میں عورتوں کا چہرے کا پردہ یعنی نقاب صرف سعودی عرب (اب وہاں بھی اس پر سختی کم ہوگئی ہے) اور افغانستان میں موجود ہے ورنہ عالم اسلام کے علماء کرام نے بالعموم چہرے کو نہ ڈھانپنے کا فتویٰ دے رکھا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ مغرب کی الحادی تہذیب کے اثرات کی وجہ سے ہے۔ اہل مغرب اپنے ہاں آنے والی مسلم خواتین کے لیے نقاب اور حجاب کی دو الگ اصلاحیں استعمال کرتے ہیں۔ نقاب کی تو وہاں اجازت نہیں البتہ حجاب کی بعض جگہ اجازت ہے یعنی مسلمان عورت اپنا چہرہ کھلا رکھے، سر اگرچہ ڈھانپ لے اور جسم چھپانے کے لیے عبایا، چادر، دوپٹہ وغیرہ استعمال کرے۔ عبایا عموماً کالے رنگ کا ہوتا ہے یوں سر ڈھانپنے اور عبایا کے استعمال سے ننگا چہرہ فوکس ہو جاتا ہے اور جیسا کہ معروف ہے کہ چہرے کا حسن ہی

فتنہ ہوتا ہے اور نگاہوں کا ہدف بنتا ہے۔ حرم مکی میں اگر آپ احتیاط بھی کریں تو ہزاروں فوکس زدہ نسوانی چہروں پر غیر ارادی نظر پڑ ہی جاتی ہے۔ جب راستہ ایک ہو اور اژدہام میں دھکے پڑ رہے ہوں اور خواہی نخواہی جسم بھی ایک دوسرے سے مَس ہو رہے ہوں تو نظروں کی حفاظت کیسے ممکن ہے؟

پھر بہت سی خواتین چہرہ کھلا رکھ کر سر تو ڈھانپ لیتی ہیں لیکن ''اوڑھنیاں اپنے سینوں پر ڈالے رکھیں'' کے حکم پر سختی سے عمل نہیں کرتیں اور عبایا بھی نہیں پہنتیں بلکہ چادر اور دوپٹے سے کام لیتی ہیں حالانکہ بیت اللہ کے احترام، ستر عورت اور ہزاروں مردوں کی موجودگی کا تقاضا ہے کہ وہ اپنا سینہ ڈھانپنے کا خصوصی اہتمام کریں۔

آپ سوچیں کہ اگر عورت کا چہرہ ننگا ہو، سینہ اچھی طرح ڈھکا نہ ہو اور جسم پر عبایا بھی نہ ہو اور مردوں سے اختلاط بے تحاشا ہو رہا ہو۔ تو کیا اس سے معقول حد تک ''شرعی پردہ'' کا حق ادا ہو جاتا ہے؟ ہمارے خیال میں تو ہرگز ایسا نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حالت احرام میں عورت کو نقاب لینے سے منع کیا ہے لیکن اس پر عمل کی کیفیت حدیث عائشہؓ سے معلوم ہوتی ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ ہم اپنا چہرہ کھلا رکھتی تھیں لیکن جب مرد حضرات ہوتے تو ہم نقاب/ چادر کا پلو گرا دیتی تھیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اس حکم سے کھینچ تان کر جتنی فقہی مراعات بھی کشید کر لی جائیں تو اس وقت حرم مکی میں بے پردگی اور اختلاط کا جو عالم ہے، اس کی حمایت نہیں کی جاسکتی اور نہ اسے شرعی قرار دیا جاسکتا ہے۔ خصوصاً ان عورتوں کے لیے جو حالت احرام کے بغیر صرف نماز اور طواف کے لیے حرم میں آتی ہیں اور چہرہ کھلا رکھنے کو حکم شرعی سمجھتی ہیں۔ لیکن نقاب کا یہ بھی مطلب نہیں کہ عورت بیچاری دھکے کھاتی اور گرتی رہے اور اسے کچھ نظر نہ آئے یا ہاتھ سے نقاب پکڑنا پڑے۔ حرم میں آپ سعودی خواتین کو دیکھ سکتے ہیں کہ نقاب بھی ہے لیکن دونوں آنکھیں کھلی ہیں اور انہیں چلنے پھرنے میں کوئی دقت نہیں۔ اصل مقصود یہ ہے کہ عورت کو اس کا احساس ہو کہ اس کا حسن پبلک کے لیے نہیں ہے اور اللہ کے گھر میں، جہاں وہ ثواب کی خاطر آئی ہے، اس کا لباس ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ وہ مردوں کی نظروں کا ہدف بنے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ اسّی (۸۰) کی دہائی میں جب مَیں ریاض میں زیر تعلیم تھا تو ایک دفعہ عمرہ کے لیے مکہ آیا اور طواف کر رہا تھا، دوپہر کا وقت تھا اور رش نہیں تھا۔ ایک نوجوان پاکستانی عورت جس کا سر اور جسم ڈھکا ہوا لیکن چہرہ کھلا ہوا تھا، طواف کر رہی تھی جب باب کعبہ

قریب آیا تو ایک ادھیڑ عمر ''مطوع'' کی اس پر نظر پڑی تو اس نے فوراً پاکستانی عورت سے کہا ''غِشوہ، غِشوہ'' اور عورت کو اشارہ کیا کہ نقاب کرو، پردہ کرو تو اس بیچاری کو مشکل سے نقاب کرنا پڑا (کیونکہ وہ تو سمجھتی تھی کہ حکم شرعی یہ ہے کہ عمرہ میں عورت کا چہرہ کھلا رہنا چاہیے)۔

کعبہ معظّمہ اور روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بڑی بڑی بلڈنگوں کے نیچے دَب کر رہ گئے ہیں

اب جو بات مَیں کرنے لگا ہوں وہ شاید حکم شرعی نہ ہو لیکن میرے دینی ذوق کو مسلسل مجروح کر رہی ہے۔ دیکھیے! مسجد نبوی کی توسیع ہوئی اور ضرورت تھی کہ ہو، لیکن اب جو مسجد نبوی کی بلڈنگ بنی ہے وہ بہت وسیع وعریض ہے، شاندار ہے، اس کی چھت اونچی ہے، مینار بلند ہیں اور اسے دیکھ کر ایک پرعظمت و پرشوکت عمارت کا تصور ابھرتا ہے۔ اور ظاہر ہے اس پر کسی کو کیوں اعتراض ہوگا۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مسجد نبوی کی عمارت کا وہ حصہ جس میں روضۂ رسول ہے، اس کی چھت نیچی ہے۔ روضۂ رسول نیچا اور سادہ سا ہے اور اس کے پاس مسجد کے عالی شان اور بلند مینار ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے روضۂ رسول مسجد نبوی کی عظیم بلڈنگ میں دَب کر رہ گیا ہے۔ آپ مسجد نبوی کو باہر سے دیکھیں مینار نظر آئیں گے، سبز گنبد نظر نہیں آئے گا۔ آپ مسجد کے قریب آ کر دیکھیں تو بھی مسجد نبوی کی عظیم الشان عمارت آپ کو مبہوت کر دے گی لیکن سبز گنبد آپ کو نظر نہیں آئے گا جب تک کہ آپ بقیع کی طرف اور باب السلام اور باب صدیق اکبر کی طرف نہ آئیں۔

مَیں جب تک مدینہ میں رہا یہ بات مجھے چبھتی رہی۔ پھر مَیں مکہ میں آ گیا تو وہاں بھی دیکھا کہ مکہ ٹاور ہوٹل اور دوسرے بلند و بالا ہوٹلز نے خانہ کعبہ اور مسجد حرام کو گھیر رکھا ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ خانہ کعبہ وادی کے نچلے حصے میں ہے اور اردگرد اونچا پہاڑی علاقہ ہے (گو اب یہ پہاڑیاں حتیٰ کہ صفا و مروہ بھی نظر نہیں آتیں)۔ یہاں بھی آپ اگر مطاف میں کھڑے ہو کر دیکھیں تو چاروں طرف کثیر منزلہ بلند و بالا ہوٹل ہیں اور کعبہ کی عمارت ان کثیر منزلہ بلند ہوٹلوں کے نیچے دبی دبی سی نظر آتی ہے اور میرے دینی ذوق کو مجروح کرتی ہے۔ میرے ذہن میں کعبہ کی عظمت اور ہیبت زدہ کر دینے والی بزرگی کا تاثر مجروح ہوتا ہے۔

دیکھیے! روحانی عظمت، بزرگی اور پاکیزگی اپنی جگہ لیکن پہلی وحی میں اللہ نے اپنے پیغمبر

کو حکم دیا کہ اپنے کپڑے پاک وصاف رکھو۔ کیوں؟ قلب کی پاکیزگی بلاشبہ اہم تر ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ظاہر بھی پاکیزہ ہو۔ ظاہر بھی باطن پر اثر انداز ہوتا ہے۔ چنانچہ سیرت نگاروں نے لکھا ہے اور معروف بات ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صاف ستھرے رہتے تھے، باقاعدگی سے غسل فرماتے تھے، صاف کپڑے پہنتے تھے، بالوں میں تیل لگاتے اور کنگھی کرتے تھے، آنکھوں میں سرمہ ڈالتے تھے۔ سادگی پسند تھے لیکن مالی خوشحالی نہ ہونے کے باوجود عید بقرعید اور وفود سے ملاقات کے لیے خصوصی اچھا لباس زیب تن فرماتے تھے۔ تو اگر پیغمبر اعظم و آخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو روحانی عظمتوں کے ساتھ ظاہر کو خوبصورت رکھنے کا حکم تھا تو کعبے کے گرد عظیم الشان ہوٹلوں کی بلڈنگیں بنانے والوں کا دینی ذوق کہاں مر گیا تھا؟ آج مکہ جائیں تو دور سے مکہ ٹاور ہوٹل کا کلاک نظر آتا ہے، خانہ کعبہ نظر نہیں آتا۔ کیوں؟ میرے بس میں ہوتو مکہ ٹاور ہوٹل اور حرم کے اردگرد دوسرے بنائے گئے کثیر منزلہ ہوٹل سب کو گرانے کا حکم دے دوں کہ وہ میرے دینی ذوق پر گراں گزارتے ہیں۔ یہ مجھے کعبہ سے اونچے نظر آتے ہیں، ان کے مقابلے میں مجھے کعبہ نیچے اور ان کثیر منزلہ بلند ہوٹلوں کے نیچے دبا ہوا نظر آتا ہے۔

پھر ایک اور نظر سے دیکھیے تو یہ مکہ ٹاور ہوٹل (اور دوسرے کثیر منزلہ ہوٹل) مجھے عالم اسلام کے قلب میں کافر مغرب کے لعنتی سودی سرمایہ دارانہ نظام کا سمبل نظر آتا ہے۔ یہ منحوس ہوٹل نہ صرف خانہ کعبہ کی عمارت کے اوپر سایہ فگن ہے اور اس پر چھایا ہوا ہے بلکہ یہ اتنا مہنگا ہے کہ اس میں صرف کروڑ پتی افراد ٹھہر سکتے ہیں اور ٹھہرتے ہیں۔ وہ غریب پاکستانی، انڈونیشی، افریقی جو ساری زندگی پیسہ پیسہ جوڑتا ہے کہ اللہ کا گھر ایک نظر دیکھ سکے تو جب وہ مکہ پہنچتا ہے تو وہ کعبہ پر چھائے ان کروڑ پتیوں کے ہوٹل دیکھتا ہے۔ اسے کعبہ کے نزدیک کوئی سستا ہوٹل نہیں ملتا جہاں وہ رہ سکے اور جلدی سے وہ ہر نماز کے لیے حرم پہنچ جائے۔ اب اسے سستے ہوٹل کعبہ سے میلوں دور ملتے ہیں۔ اب یا تو وہ ہر نماز کے لیے پیدل چل چل کر حرم آئے یا سعودی ٹیکسیوں کو پیسے دے جبکہ یہ دونوں کام اس کے لیے مشکل ہیں۔ غریبوں کے لیے بھی، بوڑھوں، کمزوروں اور عورتوں کے لیے بھی خصوصاً عربی نہ جاننے کی وجہ سے بھی۔ اور کھانے کا مسئلہ بھی ہے۔ ہر ملک کے لوگوں کو ان کے ذوق کے مطابق کھانے کی سہولت میسر ہونی چاہیے۔ نئے سرمایہ دارانہ نظام نے سستے ہوٹلوں اور ریستورانوں کو حرمین سے میلوں دور دھکیل دیا ہے اور

لوگ حرم مکی و مدنی کے قریب انگریزی نما کھانے کھا کھا کر بیمار ہوتے ہیں جبکہ یہ کھانے مہنگے بھی ہوتے ہیں، لوگوں کے ذوق کے خلاف بھی اور بعض اوقات غیر صحت مند بھی۔

ہم ان علماء کرام سے کہتے ہیں جو حرم مکہ اور حرم مدینہ کی انتظامیہ کے سربراہ ہیں کہ خدا کے لیے میری ان گزارشات پر غور کرو۔ روضۂ رسول کی عظمت بحال کرو، خانہ کعبہ کی عظمت بحال کرو۔ کثیر منزلہ مہنگے ہوٹلوں کو گرادو۔ غریبوں کے لیے سستے ہوٹل اور ریستوران حرم کے قریب بنانے کی اجازت دو۔ ساری دنیا کے مسلمان آپ کو دعائیں دیں گے۔ ہمیں ایک صاحب نے کہا کہ سعودی حکومت نے مکہ ٹاور ہوٹل کو وقف قرار دیا ہے اور اس کی ساری آمدنی حرم پر خرچ ہوتی ہے، لوگ خواہ مخواہ اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ ہمیں یہ جان کر تعجب ہوا۔ کیا اس بے بصیرت اور احمق آدمی کو جس نے سعودی حکمرانوں کو مکہ ٹاور ہوٹل (وقف) بنانے کا آئیڈیا دیا تھا، یہ پتا نہیں تھا کہ امت اگرچہ غریب بھی ہے اور گنہگار بھی لیکن تم ایک دفعہ منہ سے نکالو تو سہی کہ تمہیں حرم کے انتظام کے لیے پیسے درکار ہیں۔ خدا کی قسم! یہ امت چند دنوں میں خانہ کعبہ اور مسجد حرام کو سونے کا بنا دے گی اور تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا کہ دینے والا کون تھا اور بنانے والا کون؟

صحت کا مسئلہ

نوجوان حضرات و خواتین کو چھوڑ کر اکثر زائرین کے بارے میں ہمارا یہ تاثر تھا خصوصاً افریقہ، مشرق بعید (انڈونیشیا، ملائشیا، فلپین وغیرہ) اور پاک و ہند کی خواتین و حضرات کے بارے میں کہ ان کے پچکے ہوئے گال اور جھریوں بھرے چہرے خوراک کی کمی (Malnuitration) کے مظہر تھے۔ مجھے اس پر تشویش ہے لیکن کیا ہوسکتا ہے؟ یہودیوں اور مغربی تہذیب کے علمبرداروں نے بڑی پلاننگ سے، محنت اور کوشش سے، مسلم معاشروں پر اپنی مرضی کے حکمران مسلط کیے ہیں، جو عموماً بدقماش ہیں، آئی ایم ایف سے قرضے لیتے ہیں، کرپشن کرتے ہیں، امریکی و یورپی ملکوں میں رشوت کے پیسے بینکوں میں رکھتے ہیں، وہاں پراپرٹی خریدتے ہیں۔ مسلمان عوام غریب ہیں، مہنگائی میں پس رہے ہیں، بعض جگہ بھوکوں مر رہے ہیں، انہیں اچھا کھانے کو اور پہننے کو میسر نہیں، معیاری طبی سہولتیں بھی موجود نہیں لیکن ہمیں سمجھ نہیں آئی کہ اس کا حل کیا ہے؟ غریب، اَن پڑھ، بیمار، دبے ہوئے، پسے ہوئے لوگوں کو کہنا کہ اٹھو! انقلاب برپا کردو۔ یہ کہنا آسان ہے لیکن اس پر عمل مشکل ہے۔ پاکستان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

اسلام اور پاکستان مدیر

قادیانیت اور سپریم کورٹ کا فیصلہ

کیا کھویا، کیا پایا

اگر ساری دینی جماعتیں اکٹھی ہوجائیں تو پاکستان میں دین غالب آسکتا ہے۔اس کا لائحہ عمل

* ایک بار پھر یہ بات ثابت ہوگئی کہ پاکستان کی دینی جماعتیں اور علماء کرام اگر کسی مسئلے میں متحد ہوجائیں تو کامیابی ان کے قدم چومتی ہے۔وہ قادیانیوں کو کافر قرار دینے میں بھی اسی وقت کامیاب ہوئے جب ساری دینی جماعتوں نے مل کر جدوجہد کی۔اس دفعہ بھی کچھ جماعتوں نے سیاسی دباؤ ڈالا اور کچھ لوگوں نے عدالت میں دلائل سے معاملے کو مبرہن کیا تو انہیں کامیابی ملی۔

* چیف جسٹس قاضی فائز عیسیٰ صاحب نے معقولیت کا ثبوت دیا اور علماء کی مرضی کا فیصلہ دینے پر تیار ہوگئے۔دوسرے لفظوں میں انہوں نے خالص دینی امور میں علماء کرام کی رہنمائی اور بالادستی تسلیم کرلی اور اپنے مؤقف سے دست بردار ہوگئے۔یہ بظاہر خوش آئند ہے کہ انہوں نے ان پیراگرافس کو فیصلے سے خذف کردیا جن پر علماء اعتراض کررہے تھے۔البتہ انہوں نے اپنی ٹانگ پھر بھی اوپر رکھی اور قادیانیوں کی ضمانت کی منظوری کا فیصلہ برقرار رکھا۔ جو اصولاً انہیں واپس لے لینا چاہیے تھا۔علماء نے اپنا بڑا مطالبہ تو منوالیا اور چھوٹے اہم فیصلے کی طرف ان کا دھیان ہی نہیں گیا۔

* اس میں شک نہیں ہے کہ ہمارے حکمران طبقات کسی معقول سے معقول بات کو بھی توجہ سے نہیں سنتے اور مسئلہ حل نہیں کرتے جب تک چیخ چیخ کر نہ بولا جائے، دباؤ نہ ڈالا جائے یا سفارش نہ ڈلوائی جائے یا رشوت نہ دی جائے۔بلاشبہ سپریم کورٹ میں علماء کرام نے دلائل سے ہی بازی جیتی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر تحریک لبیک اور بعض دوسری جماعتیں شدید دباؤ نہ ڈالتیں تو سپریم کورٹ نے حرکت میں ہی نہ آنا تھا۔بہت سے لوگ تحریک لبیک پر اعتراض کرتے ہیں کہ اس نے غلط کیا جب چیف جسٹس کے سر کی قیمت مقرر کی انہیں قتل کی

سرِعام دھمکی دی اور ان کی تکفیر کی۔ اس سے سیکولر اور لبرل عناصر کو دینی جماعتوں پر تشدد اور تکفیر کی پھبتی کسنے کا موقع ملا۔ بلاشبہ نارمل حالات میں اس طرح کا رویہ غیر مستحسن اور غیر معقول ہے اور اس سے احتراز واجب ہے۔ بات دلیل ہی سے کرنی چاہیے اور تشدد سے پرہیز کرنا چاہیے لیکن جیسا کہ ہم نے کہا کہ یہاں تک دینی جماعتوں کو لانے والے بھی حکومتی اور مغرب زدہ عناصر ہیں۔ اس لیے دونوں یکساں قصوروار ہیں۔ بہرحال، ہم یہی کہیں گے کہ دینی عناصر کو تشدد اور انتہا پسندی سے پرہیز کرنا چاہیے اور بات دلیل سے کرنی چاہیے تاکہ دشمنوں کو الزام وافترا کا موقع مہیا نہ ہو۔

* آخر میں ہم ساری دینی جماعتوں اور ان کے قائدین کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ جس طرح انہوں نے تجربہ کر کے دیکھ لیا کہ وہ جس مسئلے میں متحد ہو جائیں اس میں ان شاء اللہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ تو اس وقت ہمارا سب سے بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان میں فرد، معاشرے اور ریاست کی سطح پر اسلام پر عمل نہیں ہو رہا۔ اس کے لیے ہماری تجویز یہ ہے کہ ''اتحاد تنظیمات مدارس پاکستان'' کے سربراہوں پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی جائے جو ملک میں اسلام پر عمل کا ایک متفقہ خاکہ اور نقشہ تیار کرے۔ پھر سارے ملک میں دورے کر کے سارے علماء، دینی جماعتوں اور عوام کو متحرک کرے تو ان شاء اللہ اس جدوجہد سے ملک میں اسلام غالب آ جائے گا اور مسلمان دنیا و آخرت دونوں میں کامیاب ہوں گے، ان شاء اللہ۔

یہاں یہ کہنا انتہائی ضروری ہے کہ پاکستان میں نفاذ شریعت یا غلبۂ دین کا یہ مفہوم غلط ہے کہ نفاذ شریعت بل پاس کر لیا جائے اور قوانین اسلامی بنا دیئے جائیں بلکہ اس کے لیے تعلیم، تربیت اور میڈیا کی اصلاح کو بنیاد بنا کر زندگی کے سارے شعبوں کی اصلاح کرنی پڑے گی اور ایسا نظام العمل وضع کرنا پڑے گا جس سے فرد کی تعمیر سیرت بھی اسلامی اصولوں پر ہو، معاشرے کی رسوم و رواج بھی اسلامی ہوں اور ریاست بھی اپنا اسلامی کردار ادا کرے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ علماء کرام مل کر ایسا نظام العمل وضع کر سکتے ہیں اور اس پر ساری قوم کو متحد اور متحرک کر سکتے ہیں اور اس طرح پاکستانی فرد، معاشرہ اور ریاست اسلام پر عمل کر کے دنیا و آخرت میں کامیاب ہو سکتے ہیں، ان شاء اللہ۔

غامدیت

ڈاکٹر مولانا الیاس فیصل

قادیانیت اور غامدیت کے مشترکہ افکار

اسلام کی نشأۃ ثانیہ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے، کفر کے خلاف مسلمانوں کے جذبۂ جہاد کو مٹانے کے لیے، مسلمانوں پر مغرب کے فکری شکنجہ کو کسنے کے لیے، ان پر جغرافیائی تسلط کو قائم رکھنے کے لیے اور ان کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے استعمار نے غلام احمد قادیانی کو کھڑا کیا اور اس فتنے کی آبیاری کی جو تا حال جاری ہے۔

جاوید احمد غامدی صاحب اسی ایجنڈے کو ایک نئے لبادے میں پیش کر کے امت میں تفریق پیدا کر رہے ہیں اور اسی استعماری ایجنڈے کی تکمیل کر رہے ہیں۔ غلام احمد قادیانی اور جاوید احمد غامدی کے افکار میں جو اشتراک ہے اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

۱۔ انکارِ جہاد

غلام احمد قادیانی کا مؤقف

۔ ''آج سے انسانی جہاد جو تلوار سے کیا جاتا تھا خدا کے حکم سے بند کیا گیا۔'' (روحانی خزائن:۱۶/ ۲۸)

اب چھوڑ دو اے دوستو جہاد کا خیال
دیں کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال

(روحانی خزائن:۱۷/ ۷۷)

۔ ''اب میرے ظہور کے بعد تلوار کا کوئی جہاد نہیں۔'' (روحانی خزائن:۱۶/ ۲۸)

۔ ''اب سے زمینی جہاد بند کیے گئے اور لڑائیوں کا خاتمہ۔ آج سے دین کے لیے لڑنا حرام کیا گیا۔'' (روحانی خزائن:۱۶/ ۱۷)

جاوید احمد غامدی کا مؤقف

''کفر کے خلاف جنگ کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں۔'' (مقامات:۲۶۰، ط:۵)

''یہ بالکل قطعی ہے کہ منکرینِ حق کے خلاف جنگ اور اس کے نتیجے میں مفتوحین پر جزیہ

عائد کر کے اپنی محکوم اور زیردست بنا رکھنے کا حق اس کے بعد (صحابہ کے بعد) ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔ قیامت تک کوئی شخص اب دنیا کی کسی قوم پر اس مقصد کے لیے حملہ کر سکتا ہے اور نہ کسی مفتوح کو محکوم بنا کر اس پر جزیہ عائد کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔'' (میزان:۵۹۹)

''لوگوں کے خلاف محض اس کے کفر کی وجہ سے جنگ اور اس کے نتیجے میں مفتوحین کو قتل کر کے ان پر جزیہ عائد کر کے انہیں محکوم اور زیردست بنا کر الجھنے کا حق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔ قیامت تک کوئی شخص اب نہ دنیا کی کسی قوم پر اس مقصد سے حملہ کر سکتا ہے اور نہ کسی مفتوح قوم کو محکوم بنا کر اس پر جزیہ عائد کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔'' (مقامات:۲۶۱،ط:۵)

۲۔توہین رسالت کی سزا کی مخالفت

پاکستان کے فوجداری قانون کی دفعہ 295/C میں توہین رسالت کی سزائے موت کے خلاف قادیانی لابی اور جاوید احمد غامدی سرگرم ہیں اور اس شق کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے لابنگ کر رہے ہیں۔ غامدی صاحب کہتے ہیں:

۔ ''توہین رسالت کا جو قانون ریاست پاکستان میں نافذ ہے اس کا کوئی ماخذ قرآن وحدیث میں تلاش نہیں کیا جا سکتا۔'' (مقامات:۳۲۸،طبع:۵)

۔ ''موجودہ قانون قرآن کے بھی خلاف ہے، حدیث کے بھی خلاف ہے اور فتوائے احناف کے بھی خلاف ہے۔ اسے لازماً تبدیل ہونا چاہیے۔'' (مقامات:۳۳۱،ط:۵)

۔ ''(ناموسِ رسالت کا قانون) یہ بالکل Baseless، بالکل بے بنیاد قانون ہے اور پاکستان میں اس قانون کی وجہ سے بڑے ظلم کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ اس کی کوئی مذہبی بنیاد نہیں ہے، یہ قرآن، حدیث، فقہ سب کے بالکل خلاف ہے۔ کوئی معمولی درجہ کی چیز بھی ایسی موجود نہیں ہے جو اس قانون کی بنیاد میں پیش کی جائے۔''

۔ ''اگر یہ خیال ہے کہ قرآن نے کوئی حکم دیا ہے یا حدیث میں کوئی حکم ہے، ہرگز نہیں ہے۔ میں یہ کہتا ہوں فقہ میں بھی نہیں۔ یہ افسوسناک بات ہے، اس قانون کی بنیاد قرآن میں

ہے، نہ حدیث میں اور نہ فقہ اسلامی میں ہے۔''

۳۔قادیانیت کے خلاف قوانین کی مخالفت

۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو پاکستان کی نیشنل اسمبلی نے ایکٹ ۱۹۷۴ء کی رُو سے (احمدی اور لاہوری) قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا۔ ۱۹۸۴ء میں اس قانون پر عمل درآمد کے لیے مزید قانون سازی کی گئی۔

قادیانیوں نے تاحال اس آئینی فیصلہ کو تسلیم نہیں کیا اور وہ اپنے مغربی آقاؤں کے ذریعہ اس فیصلے کو تبدیل کرنے کے لیے دباؤ ڈلوا رہے ہیں اور خود بھی اس کے خلاف مسلسل لابنگ کررہے ہیں۔ جاوید احمد غامدی صاحب نے بھی تاحال اس آئینی فیصلے کو تسلیم نہیں کیا اور وہ بھی قادیانیوں کی طرح اس کے خلاف مسلسل لابنگ کررہے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

(غلام احمد قایانی) تنہا انہیں مجرم قرار دینا ہے تو میں اس سے براءت کرتا ہوں اور اگر سب کو قرار دینا ہے تو پھر ان سب کو قرار دیں۔

(ان سب سے غامدی صاحب کی مراد حضرت بایزید بسطامیؒ، ابن عربیؒ، شہاب الدین سہروردیؒ، امام غزالیؒ، مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور شاہ اسماعیل شہید دہلویؒ ہیں)۔

۴۔انکار حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام

غلام احمد قایانی کا مؤقف

۱۔ ''یہ تو سچ ہے کہ مسیح اپنے وطن گلیل میں جا کر فوت ہو گیا۔'' (روحانی خزائن: ۳/ ۳۵۳)

۲۔ ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر بلدہ قدس (یروشلم) میں ہے اور اب تک موجود ہے۔'' (روحانی خزائن: ۸/ ۲۹۹)

۳۔ ''اور تم یقیناً سمجھو کہ عیسیٰ بن مریم فوت ہو گیا ہے اور سری نگر محلہ خانیار میں اس کی قبر ہے۔'' (روحانی خزائن: ۱۶/ ۱۹)

جاوید احمد غامدی کا موٴقف

''سیدنا مسیح علیہ السلام کے بارے میں جو کچھ میں قرآن مجید سے سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ ان کی روح قبض کی گئی اور اس کے فوراً بعد ان کا جسد مبارک اٹھالیا گیا تھا کہ یہود اس کی بے حرمتی نہ کریں۔''(اشراق: اپریل ۱۹۹۵ء، ص:۴۵)

۵۔ انکارِ نزول عیسیٰ علیہ السلام

غلام احمد قادیانی کا موٴقف

''بس میرے سوا دوسرے مسیح کے لیے میرے زمانے کے بعد قدم رکھنے کی جگہ نہیں۔''
(روحانی خزائن:۱۶/ ۲۴۳)

جاوید احمد غامدی کا موٴقف

''نزول مسیح کی روایتوں کو اگرچہ محدثین نے بالعموم قبول کیا ہے لیکن قرآن مجید کی روشنی میں دیکھیے تو وہ بھی محل نظر ہیں.... موقع محل کے باوجود اس واقعے کی طرف کوئی ادنیٰ اشارہ بھی قرآن کے بین الدفتین کسی جگہ مذکور نہیں۔ علم و عقل اس خاموشی پر مطمئن ہو سکتے ہیں؟ اسے باور کرنا آسان نہیں ہے۔''(میزان:۱۷۸)

۶۔ ظہورِ مہدی کا انکار اور احادیث مہدی کو موضوع قرار دینا

غلام احمد قادیانی کا موٴقف

۱۔ ''سچ یہ ہے کہ بنی فاطمہ سے کوئی مہدی آنے والا نہیں اور ایسی تمام حدیثیں موضوع، بے اصل اور بناوٹی ہیں۔''(روحانی خزائن: ۱۴/ ۱۹۳)

۲۔ (بنی فاطمہ کے مہدی کی بابت) مَیں ایسی حدیثوں کو صحیح نہیں سمجھتا، اور محض ذخیرۂ موضوعات جانتا ہوں۔(روحانی خزائن: ۱۳/ ۳۴۷)

۳۔ مَیں بھی کہتا ہوں کہ موعود کے بارے میں جس قدر حدیثیں ہیں تمام مجروح اور مخدوش ہیں اور ایک بھی ان میں صحیح نہیں۔(روحانی خزائن:۲۱/ ۳۵۶)

جاوید احمد غامدی کا مؤقف

۱۔ ''کسی مہدی موعود کے انتظار کی ضرورت نہیں۔'' (میزان: ۱۷۸، ط:۷)

۲۔ ''کسی مہدی کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں ہے۔قرآن مجید اس سے بالکل خالی ہے اور کسی صحیح روایت کے اندر بھی کوئی ذکر نہیں۔''

۳۔ ''اور میں یہ کہتا ہوں کہ اس افسانہ کا جو نتیجہ نکلا ہے وہ یہ کہ لوگوں کے قویٰ مضمحل ہوئے ہیں اور بجائے اس کے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو خود سمجھیں ان میں سے ہر ایک منتظر ہے ہم کو کیا کرنا ہے امام مہدی آئیں گے تو خود ہی آ کے امریکہ کی توپوں میں کیڑے ڈال دیں گے۔یہ محض ایک افسانہ ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔''

۷۔جسمانی معراج کا انکار

غلام احمد قادیانی کا مؤقف

''سیر معراج اس جسم کثیف کے ساتھ نہیں تھا بلکہ وہ نہایت اعلیٰ درجہ کا کشف تھا جس کو درحقیقت بیداری کہنا چاہیے۔'' (روحانی خزائن: ۳/۱۲۶)

جاوید احمد غامدی کا مؤقف

''بیت الحرام سے مسجد اقصیٰ تک کے سفر کی جس رؤیا کا ذکر قرآن میں ہوا ہے وہ اس کی مثال ہے،اس طرح کے مشاہدات کھلی آنکھوں سے بھی ہوتے ہیں۔'' (میزان: ۱۲۷)

نیا جال لایا پرانا کھلاڑی

جو اہل علم ودانش غامدی اسلوب تحریر وتقریر سے واقف ہیں ان پر مخفی نہیں ہے کہ موصوف نے جس عقیدہ وعمل کی بابت شکوک وشبہات پھیلانے ہوتے ہیں اس کے آغازِ بیان میں وہ اسلامی موقف کو اس قوت سے بیان کرتے ہیں کہ ہر قاری اور ہر سامع محسوس کرتا ہے کہ اس مؤقف پر پختہ یقین رکھتے ہیں لیکن ان کو اپنے اعتماد میں لینے کے بعد وہ اس میں مختلف شقیں بنا کر،احتمالات پیدا کر کے،شکوک وشبہات پھیلا کر اس مؤقف کا حلیہ ہی بگاڑ دیتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ نمبر: ۵۲)

فکرودانش

ترک مسلم صوفی سکالرشیخ کبیر ہیل مِنسکی
اردوترجمہ: عاصم رضا

مصنوعی ذہانت، ٹرانس ہیومنزم اور مابعد انسان (آخری قسط)
دنیا کا روحانی چیلنج

کسی نے مابعد انسان دنیا کی تخلیق کے بارے میں ہنوز ہم سے اجازت نہیں لی ہے، ایک ایسی دنیا جس میں مصنوعی ذہانت کے حامل الگورتھم بے شمار روایتی افعال سرانجام دیں گے۔ لوگ حیران ہوجائیں گے کہ مشینی آموزش (machine learning) کتنی تیزی سے نوکریوں کو انسانوں سے چھین لے گی۔ ترقی یافتہ ممالک میں اگلے دس سے پندرہ برسوں تک پچاس فیصد اور ترقی پذیر ممالک میں ساٹھ سے پچاسی فیصد نوکریاں ختم ہوجائیں گی۔

مصنوعی ذہانت غیر محسوس انداز میں بتدریج اور کلی طور پر ہم سے آگے نکل جائے گی اور ہمیں ان افعال کے سہارے پر چھوڑ جائے گی جو خود مصنوعی ذہانت کی بدولت ہی وجود میں آئیں گے۔ لاریب، ہم میں سے چند انسانوں کو معیشت اور مصنوعی ذہانت کے محکوم معاشرے میں مسابقت رکھنے اور مفید و کارآمد رہنے کی خاطر اپنی حیاتیاتی ذہانت کو توسیع (augment) دینے کی ضرورت محسوس ہوگی۔ مابعد انسان دنیا میں انسانی عظمت سے کیا مراد لیا جائے گا جب ہماری کارگزاری اور مزدوری کی ضرورت کم ہو جائے گی اور ہمارا بنیادی فریضہ صارف اور مفت خورے (useless mouths) بن کر رہنا قرار پائے گا جنہیں معیشت میں مفید کردار ادا کرنے کی خاطر ایک لگی بندھی آمدن (guaranteed income) کی حاجت ہوتی ہے۔

مشینی انسانوں (روبوٹس) کے ساتھ کام کرنے کے لیے ہم سے کیا درکار ہوگا؟ مستقبل کے معاشرے میں مفید اور کارآمد بن کر رہنے کے لیے ہمیں خود کو مشینی آلات کے حامل وجود (cyborg) میں ڈھالنے کی ضرورت ہوگی۔ عصبی توانائی (innervate) یا مشینی ریشوں/ بافت (cyborg tissue) کی خاطر تفصیلی نقشہ (بلیو پرنٹ) پہلے ہی سے

تیار کرلیا گیا ہے۔ برقی آلات (الیکٹرونکس) کو دماغ میں داخل کیا جا سکتا ہے نیز دماغ کا برقی آلات کے ساتھ میل ہوسکتا ہے۔ہمیں انٹرنیٹ کے ساتھ منسلک کمپیوٹروں کے مربوط جال (cloud) پر مبنی مصنوعی ذہانت کے ذریعے اپنی جسمانی ذہانت کو بڑھاوا دینا ہوگا۔ یہ تو پہلے ہی ممکن ہو چکا ہے کہ ایک ننھی سی سوئی کو دماغ میں داخل کر دینے کے بعد ایک ہمہ گیر جال (mesh) قائم کر دیا جاتا ہے جو آپ کو انٹرنیٹ کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔

جوں جوں یہ (معاملہ) آگے کو بڑھتا ہے تو ہم میں سے کچھ لوگ کہیں گے کہ ہم کو اس سے کچھ سروکار نہیں ہے تاہم آخرکار ہمارے پاس کوئی اختیار باقی نہ رہے گا۔ مفید اور کارآمد رہنے کے لیے جسمانی اور مشینی ذہانت کا ادغام درکار ہوگا تاہم یہ کس قسم کی ذہانت ہوگی؟ کیا یہ پہلے سے بھی زیادہ اعداد وشمار کرنے والی، تجزیاتی اور غیر شخصی ذہانت ہوگی؟ نیز روحانی ذہانت کو تو الگ رکھیے جو ہمیں حقیقت کے بلند درجات، اعلیٰ جذبات اور آفاقی ذہانت کی جانب لے جاتی ہے، جذباتی اور انسانی تعلقات کے لیے درکار ذہانت کا کیا ہوگا؟

اپنی جانب امڈتے ہوئے اس سیلِ معلومات کے ہاتھوں ہم پہلے ہی مصنوعی ذہانت (AI) کے سمندر میں غرق ہو چکے ہیں جو ہمارے پردۂ ذہن پر دکھائی دینے والی ہر شے، نظرِ التفات کے لیے ہمارے انتخاب، ہماری صورت گری کرنے والے بیانیے اور غیر مرئی اشیاء کو بھی متاثر کرتا ہے۔

اس کی مثال امیزون نامی ویب گاہ کی استعداد ہے کہ وہ آپ کو ایسی کتابیں تجویز کرسکتی ہے جو اس کی معلومات کے مطابق ماضی میں آپ کے زیرِ مطالعہ رہنے والی کتابوں کے مماثل ہیں نیز یکساں دلچسپی رکھنے والے دیگر افراد جنہیں پسند کر رہے ہیں۔ سسٹم میں آپ کی حیثیت محض ایک الگورتھم کی ہے اور سسٹم لائبریریوں یا کتب خانوں کے اندر تلاش کے دوران ضائع ہونے والے آپ کے وقت کو بچاتے ہوئے زیادہ بہتر طریقے پر آپ کے آئندہ مطالعہ کے لیے کتابیں تجویز کرسکتا ہے۔

اگر اس بات کی کوئی حد نہیں ہے کہ مصنوعی ذہانت (AI) آپ کے بارے میں کیا کچھ

معلومات حاصل کر سکتی ہے، تو پھر جان لیجیے کہ یہ آپ کو نہ صرف قابل مطالعہ مواد بلکہ خوراک، طبی مشورے، سماجی واقعات، دلچسپ تصورات، احباب اور عشاق فراہم کر سکے گی۔ یہ بالکل ویسے ہی زندگی کے فیصلوں سے متعلق مدد دینے کی شروعات کر سکے گی جس طرح گوگل کے نقشے (Google Maps)، راستے کی بھیڑ بھاڑ سے بچاتے ہوئے مختصر ترین راستے کا تعین کرتے ہیں۔ شاید ایک دن گوگل زندگی (Google Life) نامی ایک سافٹ ویئر (app) ہوگا جو آپ کے بارے میں خود آپ سے بہتر معلومات کا حامل ہوگا یا پھر کم از کم اس بات کا دعویدار ہوگا۔ مزید برآں، وہ زندگی کے فیصلوں میں آپ کی رہنمائی کرے گا۔

(۲)

انسان کی خود شعوری، داخلی حیات بطور منبعِ آرزو، دانش، شعور بتدریج مفقود ہوتے جائیں گے نیز کھری انفرادیت، تخلیقیت، اخلاقی جدوجہد، بے غرض ایثار اور اعلیٰ اخلاقی شعور کے امکانات بتدریج اوجھل ہوتے جائیں گے۔

اس کے برعکس، ہماری توجہ معلومات کے بحرِ ذخار میں زیادہ معلومات کی شمولیت، خود آگاہی پر مبنی اپنی تصاویر کی زیادہ سے زیادہ تشہیر، اپنی حیات کے نرگسی بیانیوں کی قلمبندی، رسمی (فارمولا) رائے کی دہرائی اور خارجی ڈیٹا کے لامتناہی دریا کی سطح پر اِدھر اُدھر ڈگمگانے پر مرکوز رہے گی۔

نیز اس سے کیا مراد ہوتی ہے جب صفتِ بشریت کے ان خصائص، ایسی اقدار اور انسانی انا سے اوپر اٹھانے والی خوبیوں کو کچلا جاتا ہے، فراموش کر دیا جاتا ہے اور ان کی جگہ مجازی حقیقت (ورچوئل ریئلٹی) اور انٹرنیٹ سے منسلک کمپیوٹر نیٹ ورک (cloud) پر مبنی ایک منتشر (کسریت زدہ) ذہن کو عطا کر دی جاتی ہے، وہ ذہن جو ہمارے خیالات کو جنم دیتے ہوئے، ان کا انتظام و انصرام کرتے ہوئے اور ہماری ترجیحات کو متاثر کرتے ہوئے ٹیکنوکریٹس کے ہاتھوں تشکیل پانے والی انسانی حیات کے لیے ایک بیانیہ فراہم کرتا ہے، بجائے اس امر کے کہ (اس ذہن کی تشکیل) دنیا بھر کی روایاتِ دانش کے ہاتھوں وجود میں آئے جو انسان کی مابعد الطبیعیاتی حقیقت کو تسلیم کرتی ہیں؟

پہلے ہی تنظیموں کا ایک مخصوص گروہ جن کے ناموں سے آپ پہلے ہی واقف ہیں، ہماری اجتماعی (یا معاشرتی) حقیقت کے نگہبانوں کی حیثیت سے ایک فیصلہ کن مقام پر قابض ہو چکا ہے۔کیا وہ ایسا بننا تصور کر سکتے ہیں یا پھر ممکن ہے کہ وہ پہلے ہی سے ایک سرکش مصنوعی ذہانت کے ایسے مرئی عناصر بن چکے ہیں جو ہماری بنیادی صفتِ بشریت کی نئی تشکیل کر رہی ہے، یا اسے تبدیل کر رہی ہے اور یہاں تک کہ اسے خطرات سے دوچار کر رہی ہے؟ ہم کیسے اس بات کو یقینی بنا سکتے ہیں کہ ہماری معاشرتی حقیقت کے یہ نگہبان، ہماری سچی صفتِ بشریت کی تفہیم سے اخذ کردہ اقدار میں حصہ دار ہوں؟ یہ ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہو گی جو انسان ہونے کے بھید کو سمجھتے ہیں اور اس کو اہمیت دیتے ہیں۔

کیا ہم ان تنظیموں کو اپنی معلومات پر اس قدر غلبہ پانے کی اجازت دیں گے کہ وہ منافع اور اقتدار کی اُن قوتوں کی خاطر ذہن سازی (برین واشنگ) کے گڑھ بن جائیں جو انسانیت کو غیر انسانی بنا رہے ہیں اور زمین پر حیات (انسانی وحیوانی) کو تباہ کر رہے ہیں؟ آج یہ مکالمہ ناگزیر ہو چکا ہے جب اشہبِ زمانہ مصنوعی ذہانت اور ٹرانس ہیومنزم کے ایجنڈے کو مناسب جواب دینے کی غرض سے حکومتوں، تعلیم، مذہب یا نفسیات کی اہلیت کو مات دے رہا ہے۔

تین دروازے

برطانیہ میں ڈاکٹر گراہم ڈاؤ نگ نے تجویز دی ہے کہ انسانی ادراک کے تین دروازے ہیں جو مصنوعی ذہانت اور انسانی اقدار کی اقلیم کے اس مابعد الطبیعیاتی جہل سے متاثر ہو رہے ہیں۔

پہلا دروازہ وہ ہے جو ہمیں خارجی کائنات تک لے جاتا ہے۔جب مجازی حقیقت سے تبدیل ہو جانے پر، اصلی حقیقت اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتی ہے نیز ایک مصنوعی حقیقت ایک متبادل کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔وہ مصنوعی حقیقت جو ایک تجارتی، سیاسی اور مصنوعی ذہانت سے بڑھاوا حاصل کرنے والی انا پسندانہ قوتوں کے ہاتھوں وجود میں آتی ہے۔

دوسرا دروازہ وہ ہے جو ہمیں داخلی کائنات تک لے جاتا ہے۔یہ وہ دروازہ ہے جو

مجازی حقیقت کے داخلی کائنات بن جانے پر بند ہو جائے گا۔

آخر کار، وہ دروازہ جو ہمیں روحانی کائنات کی جانب لے جاتا ہے، پہلے کی نسبت زیادہ تنگ ہو جائے گا۔ جب ہم اس ٹیکنالوجی کے زمانے سے تعلق رکھنے والے مصنوعی اور محکوم زدہ ماحول میں زیادہ سے زیادہ گھِر جاتے ہیں، جب ہم قدرتی دنیا اور اس کے ساتھ جڑے ہوئے ہمارے انسانی ردعمل سے محروم کر دیے جاتے ہیں، جب ہمیں مستند سماجی تعلقات کے زندہ و جاوید تجربے سے کاٹ دیا جاتا ہے تو پھر ہمیں حقیقت کی روحانی ماہیت کے سب سے زیادہ براہ راست احساس سے بھی کاٹ دیا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ تینوں دروازے منظم انداز میں تباہ ہوتے جا رہے ہیں اور یہ نقصان ناقابل تلافی ہے۔ روحانی ہم آہنگی کا حصول دشوار تر ہو رہا ہے؛ ہماری انسانیت کسریت اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہی ہے۔

انسان کی روایاتِ دانش اس امر کی بہترین کاوشیں انجام دے چکی ہیں کہ انسان کی داخلی حیات کو بیدار اور برقرار رکھا جائے، اس کو مزین کیا جائے نیز اس کو رفعت بخشی جائے۔ اگرچہ مذہبی استعاروں یعنی جنت، دوزخ، جزا و سزا، خیر و شر کو بعض اوقات غلبہ کے لیے بطور ہتھیار استعمال کیا جا سکتا ہے یا ان کو کھوکھلے رسم و رواج کی مثل ارزاں کیا جا سکتا ہے تاہم اس کے باوجود وہ زمان و مکان سے پرے ایک حقیقت، کسی دائمی جہت کی جانب اشارہ کرتے ہیں، جسے نظر انداز کرنے میں ہمارا ہی نقصان ہے۔

اگر مجھے اپنی صوفیانہ روایت کے تناظر سے روحانی رفعت کے مقصد کا لب لباب بیان کرنا ہو، تو اس سے مراد انا پرستی کے ان میلانات کو گھٹانا ہے جو حیات کی روحانی ماہیت کو ہم سے اوجھل کر دیتے ہیں، بالخصوص اس حقیقت کی جانب سے کہ جس کا تجربہ کرنے کی انسان خلقی استعداد رکھتا ہے۔ انا پرستی کی انتہائی صورتیں مثلاً خودغرضی، تکبر، نرگسیت، تعصب اور جارحیت ہماری صلاحیتِ معرفت کو محدود کر دیتی ہیں۔ ہماری انا پرستی کی سطح ہمارے کیفیت شعور (علمی احوال) نیز اس شعور میں دوسروں کے واسطے موجود احساس یگانگت اور (سب

سے بڑھ کر) خود ہماری ذات کے واضح اور متوازن تصور کا تعین کرتی ہے۔

اگر ہمارا شعور صرف مقداری تجزیے یا اعداد وشمار پر مبنی خیالات تک محدود ہو جاتا ہے، اگر ہمارا شعور بنیادی طور پر قلبی معاملات کی بجائے خارجی دنیا کے زیرِ تسلط آ جاتا ہے، اگر ہمارے اذہان معانی کی بجائے معلومات سے بھر جاتے ہیں، تو (ایسی صورت میں) ہم وجود کی ایک مصنوعی سطح اور انسانیت کی کم تر حالت پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ایسی انسانیت جو حقیقت کی کلی ترتیب کا شعور کھو چکی ہے اور جس نے خود کو ایک ذہنی ڈبے میں مقید کر لیا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ مذکورہ ڈبے کے اندر موجود الگورتھم کس قدر عظیم اور وسیع ہیں، ان کا دائرہ کار صرف اسی ڈبے تک محدود ہے اور وہ ہمیں اس ڈبے کے باہر کی خارجی دنیا کے بارے میں کوئی معلومات نہیں دیتے ہیں۔

سچی روحانیت ہمیشہ سے حقیقت کے وسیع دائروں کی کھوج میں رہی ہے اور اب بھی ہے۔ سچی روحانیت کھری صفتِ بشریت کے سوا کچھ نہیں ہوسکتی۔ سچی روحانیت روح کی پاکیزگی و رفعت اور ایک ایسے کیفی روحانی "جوہر" کی تخلیق وتشکیل کا ایک عمل ہے جس کو ہم جان سکتے ہیں نیز تجربہ میں لا سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ہمارے مادی و ریاضیاتی علوم اس جوہر کی تصدیق نہیں کر سکتے (اگرچہ بعض اوقات انسانی جسم اور خاص طور پر اعصابی نظام میں اس کے اثرات کا مطالعہ کر سکتے ہیں)، انسانی حیات کے اہم ترین اور قیمتی تجربات اسی ورحانی دائرے میں واقع ہوتے ہیں۔

انسان کی روحانی رفعت کا منصوبہ ایک ایسی شے ہے کہ تمام مادی اور سماجی فلاح و بہبود کا انحصار اسی پر ہے۔ اس کے بغیر ہم گم کردہ، سطحی انسانی مفروضوں سے آلودہ، سنگ دلانہ طمع کے شکار اور ممکنہ طور پر استبداد کے ایک ایسے نظام میں غرق ہیں جو ہماری عزیز از جان صفتِ بشریت کا ہی دشمن ہے۔

مصنوعی ذہانت (AI) کے ذریعے پیدا ہونے والے علم کے اپنے تئیں ہمہ دانی پر مبنی (کمپیوٹر) نیٹ ورک کے ساتھ متفرق انسانی اذہان اور اجسام کو جوڑتے ہوئے اپنی حیاتیاتی ذہانت میں اضافہ کرنے کی بجائے، ہمارا فرض ہے کہ اپنی اعلیٰ فطری انسانی استعداد کو بیدار

کریں۔ سپر کمپیوٹر کے حامل مشینی جسم (cyborg flesh) میں یادداشتوں کے ذخیرے کو منتقل کرتے ہوئے ماورائیت حاصل کرنے یا اپنے دماغوں کو (مشین + انسان کے مابین) ایک متواتر یکتائی (ongoing singularity) کی حامل بناوٹی حقیقت (simulated reality) کے ساتھ مدغم کرنے کی بجائے، ممکن ہے کہ ہماری ذمہ داری اس سب کے برخلاف ہو: اس فانی زندگی میں اپنی صفتِ بشریت سے فائدہ اٹھایا جائے، اس سے سبق حاصل کیا جائے اور اخلاقی دائرے کے اندر اس کی نشوونما کی جائے، خود کو آفاقی آہنگ (order) کے ساتھ چلایا جائے نیز اس ہم آہنگی کو اپنا حال بنایا جائے، تاکہ اسی (ہم آہنگی) کے ذریعے بلند سے بلند تر روحانی شعور کو حاصل کرتے ہوئے، آخر کار اسی حال میں اپنے نفوس کو ابدیت میں فنا کر دیا جائے۔

جو لوگ اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لیے Calvin Mercer کی ایک فکر انگیز کتاب

Religion and Transhumanism: The Unknown Future of Human Enhancement

مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

"Transhumanism" or "human enhancement" is an intellectual and cultural movement that advocates the use of emerging technologies to change human traits. Although they may sound like science fiction, the possibilities suggested by transhumanism are very real, and the questions they raise have no easy answers. If these enhancements—especially major ones like the indefinite extension of healthy human life—become widely available, they would arguably have a more radical impact on humankind than any other development in history.

This book comprises essays that explore transhumanism and the issues that surround it, addressing numerous

fascinating questions posed by scholars of religion from various traditions. How will "immortality" or extreme longevity change our religious beliefs and practices? How might pharmaceuticals enhance spiritual experiences? Will "post-human" technologies be available to all persons, or will a superior "post-human race" arise to dominate the human species? The discussions are as intriguing as the future they suggest.

اوپن اے آئی اور گوگل ڈیپ مائنڈ کے سربراہان سمیت متعدد ماہرین نے خبردار کیا ہے کہ مصنوعی ذہانت انسانیت کے خاتمے کا باعث بن سکتی ہے برطانوی ماہر طبیعیات اسٹیفن ہاکنگ کا خیال تھا کہ انتہائی ذہین مشینیں ہمارے وجود کے لیے خطرہ ہیں۔ انہوں نے اپنی موت سے چار سال قبل 2014ء میں بی بی سی کو بتایا تھا کہ 'مکمل مصنوعی ذہانت کی ترقی کا مطلب نسل انسانی کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا تھا کہ اس سطح کی ذہانت والی مشین خود ہی شروع ہوجائے گی اور بڑھتی ہوئی شرح سے خود کو نئے سرے سے ڈیزائن کرے گی۔ ان کی پیش گوئی کے مطابق ''انسان، جو سست حیاتیاتی ارتقا کی وجہ سے وہ صلاحیت نہیں رکھتے ہیں اور وہ مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہوں گے اور یوں وہ اس ٹیکنالوجی سے ہار جائیں گے۔''

ڈاکٹر عطاء الرحمان کے بقول مصنوعی ذہانت (AI) کا ذکر آج ہر طرف ہے۔ یہ تیزی سے بڑھتا ہوا شعبہ ہے جس کا اثر زندگی کے ہر پہلو میں نظر آنے لگا ہے۔ اس کے بہت سے فوائد ہیں لیکن اس کا بے دریغ استعمال انسانی بقاء کے لیے ایک سنگین خطرہ بھی بن سکتا ہے۔ انہی فوائد و نقصانات کو سمجھنا اور اعتدال میں استعمال کرنا ہم پر منحصر ہے، بین الاقوامی سطح پر مصنوعی ذہانت کے استعمال کے قوانین بنانا اور حدود طے کرنا انتہائی ضروری ہے۔

اسلام اور مغرب

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

سرمایہ دارانہ ریاست میں کامیاب عوامی مزاحمت
کیا احتجاج سے نفاذ اسلام کی راہ ہموار ہو سکتی ہے؟

سرمایہ دارانہ ریاستوں میں عوامی احتجاج کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ کے ریاستی تحکم کا مقصد سرمایہ دارانہ انفرادیت کی عمومی تخلیق ہے۔سرمایہ کوئی مادی شے نہیں۔وہ حرص وحسد کی تجسیم ہے۔ایک ایسی روحانی قوت جو اپنی بڑھوتری کی مستقل جستجو میں ابدان اور وسائل (دولت) کو مسخر کرتی رہتی ہے۔سرمایہ کا معاشرتی اور ریاستی غلبہ اس پر منحصر ہوتا ہے کہ عوام حریص وحاسد ہوتے چلے جائیں۔

جمہوری عمل کے ذریعے عوام کو اس بات کا موقع فراہم کیا جاتا ہے کہ وہ ریاستی پالیسی کی تصدیق یا تردید کریں۔جمہوری عمل کے ذریعے عوام یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ریاستی پالیسیاں کس حد تک ان کی خواہشات نفسانی کے فروغ کے لیے مفید ثابت ہو رہی ہیں۔جمہوری عمل کا مقصد عوام میں حرص اور حسد کا فروغ ہوتا ہے یعنی سرمایہ دارانہ انفرادیت کی تخلیق۔جمہوری عمل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک ملک کے عوام کس حد تک حرص وحسد سے مغلوب ہوئے۔

لہٰذا سرمایہ دارانہ تحکم کی بقا کے لیے جمہوری عمل کا جاری رکھنا ضروری ہے۔جمہوری عمل لبرل بھی ہو سکتا ہے اور استبدادی بھی۔لیکن دونوں قسم کے جمہوری نظام عوامی تائید کے ہمیشہ محتاج رہتے ہیں۔دونوں جمہوری نظاموں میں عوام ہی یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ سرمایہ کاری کا جو منہج ریاستی مقتدرہ اختیار کیے ہوئے ہے اس کا کوئی جواز ہے یا نہیں؟

جمہوری مزاحمت

جمہوری نظام میں عوامی نفوذ کے دو طریقے ہوتے ہیں۔انتخابی اور احتجاجی۔دونوں کا مقصد ریاستی پالیسیوں میں تبدیلی ہوتا ہے۔انتخابی اور احتجاجی عمل کا مقصد ریاستی غالب مقتدرہ کو بے دخل کرنا بھی ہو سکتا ہے۔انتخابی عمل سے حزب اختلاف کی جماعتیں برسر اقتدار آتی ہیں

اوراحتجاج کے ذریعے بیرون ریاستی گروہ (طالب علم، محنت کش اور دانش ور) بھی اقتدار حاصل کر سکتے ہیں۔عموماً انتخابی اوراحتجاجی عمل سے جمہوری نظام معطل نہیں ہوتا مستحکم ہوتا ہے۔

اس مضمون میں ہم انتخابی عمل سے صَرفِ نظر کرتے ہوئے احتجاجی عمل کی نوعیت پر توجہ مرکوز کریں گے۔

دورِ حاضر میں کامیاب عوامی احتجاج کئی سرمایہ دارانہ ممالک میں ہوا ہے مثلاً مشرقی یورپ اور لاطینی امریکا کے ممالک اور حال ہی میں بنگلہ دیش میں۔ان احتجاجوں کو کامیاب ان بنیادوں پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کے نتیجہ میں ریاستی مقتدرہ تبدیل ہوئی اور ریاستی پالیسیوں میں بھی تغیر ہوا۔سب سے کامیاب احتجاج مشرقی یورپ اور ایشیائے کوچک میں ہوا جہاں احتجاج کے ذریعے ریاستی سرمایہ کاری کی جگہ نجی سرمایہ کاری برسر اقتدار آ گئی اور عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں ان علاقوں کی حیثیت بالکل بدل گئی۔نظریاتی سطح پر مشرقی یورپی احتجاجوں کے ذریعے اشتراکیت کی جگہ قوم پرست ریاستی بیانیہ نے لے لی۔جمہوری نظام مستحکم رہا ان معنوں میں کہ عوام اور تبدیل شدہ سرمایہ دارانہ مقتدرہ کے روابط اور تعلقات ویسے ہی رہے جیسے کہ وہ احتجاج سے قبل تھے۔

لاطینی امریکی احتجاج اتنے کامیاب نہ ہو سکے۔ان کے نتیجہ میں بھی مقتدرہ تبدیل ہوئی اور ریاستی سرمایہ کارانہ پالیسیاں بھی تبدیل ہوئیں۔لیکن یہ تبدیلیاں دیرپا ثابت نہ ہوسکیں۔برطرف مقتدرہ جلد واپس اقتدار میں آ گئی۔علاقہ کا عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں مقام تبدیل نہ ہوسکا اور عوام کے سرمایہ دارانہ حقوق کے حصول میں توسیع نہ ہوسکی۔آج نکارا گوا اور وینزویلا کے علاوہ لاطینی امریکا کی گلابی لہر نزع کی کیفیت میں ہے۔

اسی طرح جنوبی یورپ (یونان، پرتگال اور اسپین) کے عوامی احتجاج کامیاب نہیں قرار دیے جا سکتے۔نہ عرب بہار کی مزاحمتیں نتیجہ خیز ثابت ہوئیں۔بنگلہ دیش کا حالیہ احتجاج بھی کسی بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت نہیں ہوگا۔پاکستان کے 1968ء-69 اور 1977ء کے احتجاج بھی ناکام کہے جا سکتے ہیں کہ ان کے نتیجہ میں نہ نظاماتی تبدیلی رونما ہوئی نہ عوام کے سرمایہ دارانہ حقوق کی فراہمی میں اضافہ ہوا۔

یہ سب سرمایہ دارانہ احتجاج تھے جن کا مقصد عوام کے سرمایہ دارانہ حقوق کا فروغ تھا اور ریاستی اداراتی ردوبدل کو بھی اسی تناظر میں برتا گیا۔کامیاب سرمایہ دارانہ احتجاج ملک کے عوام کے 2 سے 3 فیصد عوام کو متحرک کرتے ہیں۔ دوران احتجاج وہ متشدد ہوتے جاتے ہیں اور دستوری پابندیوں کو عبور کر لیتے ہیں۔ ریاستی مقتدرہ کے کچھ عناصر بالخصوص بری فوج، پولیس اور میڈیا ان سے تعاون پر گاہے گاہے آمادہ ہوجاتے ہیں اور عالمی سامراجی قوتیں ان سے کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر مصالحت کر لیتی ہیں۔ کامیاب سرمایہ دارانہ احتجاجوں سے عالمی سرمایہ دارانہ تغلب کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔

اسلامی عوامی احتجاج

دورِحاضر میں کامیاب اسلامی احتجاج صرف 1976ء تا 1979ء ایرانی انقلاب ہے۔ ہم اس احتجاج کو کامیاب اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں شرع نافذ ہوئی۔ اقتدار علمائے کرام کے ہاتھ میں آیا اور ریاستی فیصلہ سازی علوم اسلامی کے تناظر میں کی جانے لگی۔ جو غیر اسلامی قوتیں احتجاج میں شریک تھیں (لبرل، کمیونسٹ، انارکسٹ) ان کو انقلابی عمل سے بے دخل کر دیا گیا۔ عوام کے تحرک کا جذبۂ محرکہ سرمایہ دارانہ حقوق کی طلب نہیں بلکہ اسلامی عصبیت تھی اور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہایت استقامت کے ساتھ ایرانی مسلمان سامراجی مصائب اور مشکلات جھیل رہے ہیں اور علمائے کرام پر ان کا اعتبار متزلزل نہیں ہوا۔ ایرانی عوام بحیثیت مجموعی سرمایہ دارانہ حقوق کے نہیں اخروی اصلاح کے طالب ہیں۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ عوامی اسلامی احتجاج کے مقاصد سرمایہ دارانہ عوامی احتجاج سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ عوامی احتجاج کو کامیاب اس وقت قرار دیا جانا چاہیے جب اس کے نتیجہ میں عوام کے سرمایہ دارانہ حقوق فروغ پائیں۔ عوامی احتجاج کو کامیاب اس وقت کہا جائے گا جب اس کے نتیجہ میں سرمایہ دارانہ ریاستی نظام بتدریج تحلیل ہو، شرع نافذ ہو اور ریاستی فیصلے علوم اسلامی کے تناظر میں مرتب اور نافذ کیے جانے لگیں۔ اسلامی عوامی احتجاج کا ہدف سرمایہ دارانہ نظام کی اصلاح نہیں اس کی تسخیر ہوتا ہے۔

آج کل جماعت اسلامی ریاستی پالیسی میں تبدیلی کے لیے احتجاجی سیاست پر توجہ مرکوز

کیے ہوئے ہے۔ یہ عوامی اسلامی احتجاج نہیں خالص سرمایہ دارانہ احتجاج ہے جیسے 1968 اور 1977 کے احتجاج تھے بلکہ 1977 کے احتجاج کے آخری دور میں تھوڑا بہت اسلامی تشخصاتی اظہار تھا وہ بھی حالیہ احتجاجی مہم میں معدوم ہے۔ احتجاجی بیانیہ میں مبہم سے مبہم انداز میں بھی اسلام کا ذکر نہیں۔ پورا زور سرمایہ دارانہ ظلم کے خلاف جدوجہد پر ہے۔ نظاماتی تبدیلی کا بھی احتجاجی بیانیہ میں کوئی ذکر نہیں۔ مطالبات بجلی کی قیمت میں تخفیف، آئی پی پیز سے کیے گئے معاہدات میں ترمیم اور شرح افراط زر میں کمی تک محدود ہیں۔

یہ احتجاج "حق دو کراچی کو" کی تحریک کا ملکی سطح پر تسلسل ہے۔ "حق دو کراچی کو" کی تحریک ایک نسبتاً کامیاب سرمایہ دارانہ احتجاج تھا جس کے نتیجہ میں بلدیاتی سطح پر جماعت اسلامی کا سرمایہ دارانہ عوام دوست تشخص ابھرا۔ کیا اس قسم کی کامیابی موجودہ احتجاجی مہم سے ملکی سطح پر کی توقع کی جاسکتی ہے؟

اس کے امکانات محدود ہیں۔ ہم اس پوزیشن میں نہیں کہ ملک کے دو سے تین فیصد افراد (یعنی پانچ سے سات ملین) کو سڑکوں پر لاسکیں۔ بنگلہ دیش کے حالیہ احتجاج میں تقریباً ساڑھے تین ملین افراد ایک اندازے کے مطابق شریک تھے۔ پھر احتجاج کو پرامن رکھنے اور دستوری جکڑ بندیوں کی پابندی جن کو ہم قبول کرتے ہیں احتجاج کی ہمہ گیریت کو محدود کرے گی۔ ملکی معیشت مستحکم ہو رہی ہے۔ شرح افراط زر ایک اونچی سطح پر پہنچ کر اپنے تاریخی مقام پر آ گیا ہے۔ عوام معاشی محرومیوں کو برداشت کرنے کے عادی ہیں۔ پھر سیاسی تبدیلی سے فائدہ اٹھانے والی اصل قوت تحریک انصاف ہے جو ملکی سطح پر ہم سے کہیں زیادہ مقبول ہے۔ ہماری احتجاجی مہم سے اصل فائدہ تحریک انصاف ہی کو پہنچے گا۔ اگر وہ سامراج اور انتظامیہ سے سمجھوتا کر کے اقتدار میں آئی تو نہ عوام کی معاشی محرومیاں کم ہوں گی نہ کسی نظاماتی تبدیلی کا کوئی امکان ہے۔ یہ محض سرمایہ دارانہ ریاستی اشرافیہ میں گردش (circulate of elite) کا ایک عمل ہوگا۔

ان تمام حقائق کو نظر انداز کیجیے اور فرض کیجیے کہ یہ احتجاجی مہم ان معنوں میں کامیاب ہو جاتی ہے کہ سرمایہ دارانہ محرومین اور مظلومین کی ایک بڑی تعداد متحرک بھی ہو جاتی ہے اور جماعت اسلامی کو اقتدار میں لے آتی ہے تو کیا ہم ایک اسلامی حکومت قائم کرسکیں گے؟ اسلامی

حکومت کے قیام کے نتیجہ میں سامراج ہم پر چڑھ دوڑے گا جیسا کہ اس نے ایران، افغانستان اورسوڈان (اور 2013ء میں مرسی کے مصر) میں کیا تھا۔ ملک شدید معاشی اور معاشرتی بحرانوں کا شکار ہوجائے گا۔کیا سرمایہ دارانہ محرومین اور مظلومین وہ قربانیاں دینے اور آزمائشیں برداشت کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے جو ایرانی اور افغانی عوام کئی دہائیوں سے دے رہے ہیں۔

اس کا کوئی امکان نہیں۔سرمایہ دارانہ مظلومین ہم سے مطالبہ کریں گے کہ بجلی سستی کرو، روزگار عام کرو، غربت مٹاؤ، سرمایہ دارانہ آزادیاں فراہم کرو۔ ہماری کارکردگی انہی پیمانوں پر جانچی جائے گی۔نفاذِ شریعت اور تحکم علوم اسلامی کے پیمانوں پر نہیں، ہم سامراج اور سرمایہ داری کے تسلط کو قبول کرنے پر مجبور ہوجائیں گے۔سرمایہ دارانہ ریاست جماعت پر قبضہ کرلے گی جیسا کہ پختون خواہ میں 2002ءتا 2006ء اور ضیاء الحق کے دور(1978ء تا1989ء) میں ہوا۔اور ہمارا یہ مفروضہ کہ سرمایہ درانہ عدل کی فراہمی اسلامی عصبیت کو فروغ دیتی ہے غلط ثابت ہوجائے گا۔

احتجاج سے نفاذ اسلام کی راہ کیسے ہموار کی جائے؟

ہماری جماعت (جماعت اسلامی)ایک اسلامی انقلابی جماعت ہے۔ ہم تخیلاتی نہیں ہیں۔ہمیں اس بات کا ادراک ہے کہ پاکستان میں جمہوری عمل میں شرکت اسلامی انقلابی جدوجہد کو آگے بڑھانے کے لیے ناگزیر ہے۔انتخابی اور احتجاجی عمل میں شرکت ضروری ہے لیکن اس شرکت کا مقصد سرمایہ دارانہ اقتداری نظام کی اصلاح نہیں، اس کا انہدام ہے۔یعنی ہم اقتدار سرمایہ دارانہ ریاستی اداروں (پارلیمان، عدلیہ، انتظامیہ اور میڈیا) سے غیر سرمایہ دارانہ ریاستی اداروں کی طرف منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک طویل المدت عمل ہے جو ملک کی بیش تر اسلامی سیاسی اور اصلاحی جماعتوں کے اتحاد اور اشتراک عمل کا متقاضی ہے۔اس اشتراک عمل کی بنیاد پر ملک بھر میں ایک ایسا بین المسلکی اتحاد مساجد قائم اور منظم کیا جا سکتا ہے جو غیر سرمایہ دارانہ خطوط پر کام کرے اور جس کا مقصد محلہ اور بازار کی سطح پر عدلیہ، انتظامیہ اور میڈیا خدمات کی فراہمی ہو۔حلال رزق کی فراہمی اور محلہ اور بازار کی سطح پر قیمتوں پر کنٹرول بھی اس کی ذمہ

داریوں میں شامل ہیں۔تمام مساجد کے امام عوام کے جائز قائد کے طور پر تسلیم کیے جائیں۔

یہی سرمایہ دارانہ استحصال اور مظالم کو رفع کرنے کا فطری اسلامی طریقہ ہے۔ہم سرمایہ دارانہ ریاست سے سرمایہ دارانہ ظلم کو رفع کرنے کے لیے بے سود مطالبات نہیں کرتے بلکہ اس کے سرمایہ دارانہ تحکم کی استعداد کو مجروح کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔ یوں سرمایہ دارانہ ناانصافیوں اور محرومیوں کے خلاف ابھرنے والے جذبات کو اسلامی عصبیت کے فروغ سے مربوط کیا جاسکتا ہے۔

انتخابی اور احتجاجی عمل کا مقصد مخلصین دین کے ہاتھوں میں ریاستی قوت کو مرکوز کرنا اور عوام کو مخلصین دین کی قیادت میں منظم کرنا ہے۔ جیسے جیسے ملکی سطح پر بین المسلکی اتحاد مساجد فعال ہوتا جائے گا ویسے ویسے معاشرہ غیر جمہوری بنیادوں پر منظم ہوتا جائے گا اور اقتدار اسلامی کی معاشرتی بنیادیں مستحکم ہوں گی۔ریاستی اداروں (مقننہ،عدلیہ،انتظامیہ،کارپوریشن، میڈیا) کا معاشرتی تسلط مجروح ہوتا جائے گا اور اسلامی انقلاب کی راہ ہموار ہوتی جائے گی۔

اس نوعیت کی ادارتی صف بندی کے بغیر انتخابی اور احتجاجی عمل میں شرکت سرمایہ دارانہ ریاستی نظام میں انضمام کا ذریعہ بنتی رہے گی۔

بقیہ: قادیانیت اور غامدیت کے مشترکہ افکار

عقیدہ ختم نبوت کے ساتھ بھی ان کا یہی طرز عمل ہے کہ ایک طرف وہ ختم نبوت پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں اور دوسری طرف مرزا غلام احمد قادیانی کو حضرات صوفیاء کی اوٹ میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے لیے نرم گوشہ پیدا کرتے ہیں نیز وہ قرآن اور سنت کی تعلیمات اور آئین پاکستان کے مطابق قادیانیوں کو کافر نہیں سمجھتے۔

ہم نے مندرجہ بالا سات عنوانات پر قادیانی اور غامدی مشترکہ افکار وہداف کو دونوں طبقوں کے اصل حوالہ جات کی روشنی میں آپ کے سامنے پیش کردیا ہے۔اہل علم ودانش کے لیے مقام غور وفکر ہے کہ دورِ حاضر میں قادیانیت کے استعماری اہداف اور مغربی مقاصد کا علمبردار غامدی صاحب کے علاوہ کون ہے؟

تبصرۂ کتب مدیر

ماہنامہ ترجمان القرآن کا 'احیائے اسلام' نمبر

(۱)

ماہنامہ ترجمان القرآن برصغیر کی دینی تاریخ کا ایک تابندہ ستارہ ہے اور کسی تعارف کا محتاج نہیں۔اس کے حالیہ مدیر اور نائب مدیر کی محنت قابل داد ہے کہ انہوں نے عصر حاضر میں احیائے اسلام کے موضوع پر بہت سے نمایاں اہل علم سے مقالات لکھوائے اور عالمی ترجمان القرآن کے اگست اور ستمبر ۲۰۲۴ء کے شماروں میں ان کی اشاعت کا اہتمام کیا اور کچھ مضامین اکتوبر میں بھی شائع ہوں گے۔

ترجمان القرآن کے مقالات پر تبصرہ کرنے سے پہلے ہم اپنے بعض تاثرات قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں:

ابتدائی تاثر

اس علمی مذاکرے میں مدیر محترم نے جو سوال فریم کیا، اسے پڑھتے ہی ہمارا ابتدائی تاثر یہ تھا کہ سوال صحیح فریم نہیں ہوسکا کیونکہ:

* مولانا مودودیؒ نے دین اور اس کا مقصد جو سمجھا اور عمر بھر ترجمان القرآن اور دوسری تحریروں وتقریروں کے ذریعے سمجھایا، اس کے لیے انہوں نے حکومت الٰہیہ، اقامت دین، اسلامی نظام زندگی کی اصطلاحات وضع کیں۔قیام پاکستان کے بعد وہ غلبۂ دین، نفاذِ شریعت اور اسلامی انقلاب کے الفاظ بھی استعمال فرماتے رہے لیکن انہوں نے 'احیائے اسلام' کی اصطلاح عموماً استعمال نہیں کی (اگرچہ جماعت بنانے سے پہلے اس کی ضرورت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے 'تجدید واحیائے دین' کے عنوان سے ایک کتابچہ ضرور لکھا) کیونکہ وہ عالم دین تھے اور جانتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس نے میری کسی متروک سنت پر عمل کیا اور اسے زندہ کیا، اسے سو شہیدوں جتنا اجر ملے گا[۱] گویا احیائے دین کا مطلب ہے

[۱] سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۲۱۰

دین کے ان اعمال ونصوص پر عمل کر کے انہیں تازگی اور حیاتِ نو بخشنا جن پر لوگوں نے عمل چھوڑ دیا ہو۔ مطلب یہ کہ دینی احکام پر عمل کرنا۔ گویا یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یا دعوت واصلاح کا متقاضی ہے جس کا ذریعہ قرآن حکیم کی رو سے 'تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس' ہے۔ خلاصہ یہ کہ مولانا مودودیؒ نے 'احیائے اسلام' کی اصطلاح اپنے کام اور اپنی جماعت کے کام کے لیے استعمال نہیں کی۔

* دراصل جو سوال بنتا تھا اور جو اہل علم سے پوچھا جانا چاہیے تھا، وہ یہ تھا کہ ہم نے (اور جدید دینی تحریکوں نے) تقریباً ایک صدی پیشتر 'اقامتِ دین کے عنوان سے ایک منہج طے کیا تھا جس کی بنیادی حکمت عملی یہ تھی کہ سیاسی جدوجہد کے ذریعے اقتدار حاصل کر کے دین کو غالب کر دیا جائے لیکن یہ حکمت عملی زیادہ کامیاب نہیں ہوئی اور اس سے وہ مقاصد پوری طرح حاصل نہیں ہوئے جو پیش نظر تھے لہٰذا اہل علم سے درخواست ہے کہ وہ اس موضوع پر اور ممکنہ متبادل حکمت عملی پر غور کریں۔

* پھر ہمیں یہ فرق بھی محسوس ہوا کہ مولانا مودودیؒ عمر بھر ترجمان القرآن کے ذریعے لوگوں کی رہنمائی کرتے رہے کہ دین کیا ہے، اس کے تقاضے کیا ہیں اور اس کے لیے جدوجہد کیسے کرنی چاہیے۔ انہوں نے ترجمان میں لوگوں سے کبھی نہیں پوچھا کہ ہمیں بتاؤ کہ دین کو غالب اور نافذ کرنے کے لیے ہماری حکمت عملی یا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے جیسا کہ اب مدیر محترم نے اہل علم سے پوچھا ہے۔

دوسرا تاثر

تاہم جب ہم نے ترجمان القرآن کے اگست اور ستمبر کے شماروں کے مضامین کا مطالعہ کیا تو ہمیں محسوس ہوا کہ ہمارا ابتدائی تاثر درست نہیں تھا۔ ترجمان کے مدیر اور نائب مدیر صاحب نے گہرے تدبّر اور بڑی حکمت سے سوال فریم کیا ہے اور شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ جماعت کی تنظیمی ساخت لبرل نہیں ہے لہٰذا قیادت اور شاید کارکنان کے بعض عناصر اپنی 'ناکامی' کے کسی براہ راست سوال کو ناپسند کر سکتے تھے لہٰذا مدیر محترم نے حکمت سے 'اقامت دین' یا 'اسلامی انقلاب' کی بجائے 'احیائے اسلام' کی اصطلاح استعمال کی اور 'فکری' کے ساتھ

مطلوب 'عملی' اقدامات کا ذکر کر کے اپنا مقصود حاصل کرلیا۔لہٰذا اکثر اہل علم نے جو جوابات دیے ہیں وہ تحریک اسلامی کی معاصر حکمت عملی ہی سے متعلق ہیں۔ گویا جماعت کے اندر سوچنے سمجھنے والے عناصر کے لیے متبادل فکر وعمل کے کئی دروا ہوگئے ہیں اور جو لوگ جمودی رویہ رکھتے ہیں، ان کو بھی اپنے ہی پرچے میں تحریک اسلامی کے کرنے کے مزید کئی کاموں کا علم ہوگیا ہے۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ علمی مذاکرہ اہل جماعت کے لیے مفید ہے اور انہیں اس سے استفادہ کرنا چاہیے بلکہ ہم تجویز کریں گے کہ ان مقالات کو جمع کر کے ایک کتاب کی صورت دے دی جائے اور اسے ضلعی ،صوبائی ومرکزی قیادت اور شوریٰ کے ارکان کے لیے 'لازمی مطالعہ' کی کتاب بنادیا جائے اور جماعتی قیادت کے لیڈرشپ ٹریننگ پروگرام میں بھی اس سے لازماً استفادہ کیا جائے۔

ہنرش نیز بگو

ہم تحدیث نعمت کے طور پر عرض کرتے ہیں کہ ہم نے بھی اس موضوع پر برسوں غور کیا ہے اور اپنی تصانیف اور البرہان میں اس سوال کا تفصیلی جواب دیا ہے جو اہل علم کے سنجیدہ غور وفکر کا مستحق ہے۔

مزید یہ کہ ہم نے نومبر ۲۰۲۳ء میں فلیٹیز ہوٹل لاہور میں ایک سیمینار منعقد کیا جس کا عنوان تھا ''پاکستان میں احیائے اسلام۔دینی قوتوں کی حکمت عملی کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا جائزہ''۔ پھر ہم نے دسمبر ۲۰۲۳ء میں یہی سیمینار اسلام آباد میں بھی رکھا اور دونوں جگہ جماعت اسلامی کے اہل علم کو بھی بلایا۔ اور آنے والوں کو اس سوال کا واضح جواب دیا کہ پاکستان کی دینی قوتیں احیائے اسلام میں کیوں کامیاب نہیں ہوسکیں اور آئندہ کیسے کامیاب ہوسکتی ہیں۔

(۲)

اس تمہید کے بعد اب ہم ان وقیع مقالات کی طرف آتے ہیں جو ترجمان القرآن کے لائق اور محنتی مدیر اور نائب مدیر نے اہل علم سے لکھوائے ہیں۔ چونکہ مضامین کی تعداد زیادہ ہے لہٰذا ہم صفحات اور وقت کی کمی کے پیش نظر صرف چند مقالات پر مختصر تبصرہ کریں گے۔

ہماری رائے میں اس علمی مذاکرے کا بہترین مقالہ **ڈاکٹر اسعد زمان صاحب** کا ہے جنہوں نے احیائے اسلام کے لیے تعلیم وتربیت کے مرکزی کرداراوراس کی اہمیت پرزوردیا ہے۔ان کے مقالے کا حاصل یہ ہے کہ نظام تعلیم وتربیت کی اسلامی تشکیل نو ہونی چاہیے اور اسے مغربی فکروتہذیب کے ملبے سے نکال کر روبہ عمل لانا چاہیے تاکہ ایسے افراد تیار ہوسکیں جو دین پرعمل کرنے والے ہوں اور جواحیائے اسلام کے لیے جدوجہد کرنے کے اہل بھی ہوں اوراس کے پُرجوش داعی بھی۔ڈاکٹر صاحب نے اپنے مقالے کےآخر میں پس چہ باید کرد کے عنوان سے تعلیم کی اسلامی تشکیل نو کا جولائحہ عمل دیا ہے وہ بہت مختصر ہے۔اگرڈاکٹر صاحب اس پر تفصیل سے روشنی ڈالتے تو اہل فکراورنظام تعلیم وتربیت سے متعلق افراد کے لیے زیادہ مفید ہوتا۔

سیدسعادت اللہ حسینی صاحب (امیر جماعت اسلامی ہند) کا مقالہ فکری لحاظ سے بہت اہم ہے۔ان کے مقالے کا خلاصہ یہ ہے کہ تحریک اسلامی کو کامیاب ہونے کے لیے خارج کی بجائے داخل پرزیادہ توجہ دینی چاہیے کہ جب تک ایمان،تعمیر سیرت اوراخلاقی ترفع کو ہدف نہ بنایا جائے محض غلبۂ اسلام کی سیاسی جدوجہد کامیاب نہیں ہوسکتی۔

یہ بھارتی مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے کہ وہاں جماعت اسلامی کو بہترین قیادت میسرآئی ہے۔وہاں کے اکثر امرائے جماعت عالم دین تھے اور بعض تو دینی علوم کے ساتھ جدید تعلیم کے لحاظ سے بھی اعلیٰ علمی صلاحیتیں رکھتے تھے۔جماعت کے سابق امراء میں سے ڈاکٹر عبدالحق انصاری مرحوم بھی تھے جو ہارورڈ کے تعلیم یافتہ تھے اورلطف کی بات یہ ہے کہ ان کا موضوع تزکیہ وتصوف تھا۔موجودہ امیر سیدسعادت اللہ حسینی صاحب پیشے کے لحاظ سے انجینئر ہیں لیکن صاحب علم بھی ہیں اورتخلیقی ذہن بھی رکھتے ہیں۔وہ جمود کی بجائے حرکت واجتہاد کے قائل ہیں وہ مکھی پہ مکھی مارنے اورلکیر پیٹنے کی بجائے افکارتازہ پیش کرنے کا رجحان رکھتے ہیں۔ اپریل ۲۰۲۰ء میں انہوں نے 'عصر حاضر میں اسلام کو درپیش چیلنج' کے موضوع پر جماعت کے جریدے 'زندگئ نو' میں ایک جاندار اورشاندار مقالہ لکھا جو البرہان شمارہ مئی ۲۰۲۰ء میں شائع ہوا۔اس مقالہ میں انہوں نے لکھا کہ جب مولانا مودودیؒ نے تحریک اسلامی کی بنیادرکھی

تو اس وقت ماحول پر سیاسی فکر کا غلبہ تھا لہٰذا تحریک اسلامی کی بنیادی حکمت عملی کی تشکیل پر وہی فکر اثر انداز ہوئی۔ ان کے خیال میں اب فکری سطح پر تہذیبوں کی کشمکش کا غلغلہ ہے لہٰذا تحریک کی نئی حکمت عملی وضع کی جانی چاہیے جو 'تہذیب مرکز' ہونی چاہیے نہ کہ سیاست مرکز۔

ہم نے اس کے جواب میں البرہان شمارہ جون ۲۰۲۰ء میں لکھا (اور کوشش کر کے مضمون ان کو ذاتی طور پر بھجوایا) کہ تحریک اسلامی کی نئی حکمت عملی نہ سیاست مرکز ہونی چاہیے اور نہ تہذیب مرکز بلکہ یہ "فرد مرکز" ہونی چاہیے کیونکہ جب تک تحریک فرد کو نہیں بدلے گی، اجتماعی اور سیاسی تبدیلی آ ہی نہیں سکتی کیونکہ معاشرہ افراد ہی سے مل کر بنتا ہے اور ریاست کو بھی افراد ہی چلاتے ہیں۔ قرآن وسنت کی رہنمائی بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو انقلاب اور تبدیلی کا جو منہج بتایا وہ ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ والْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ تھا اور اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں پیغمبر ﷺ نے اپنی تیئس سال کی نبوی زندگی میں یہی کام کیا جس کے نتیجے میں اسلامی معاشرہ بھی قائم ہوا اور اسلامی ریاست بھی۔

سید امین الحسن صاحب آپ جماعت اسلامی ہند کے نائب امیر ہیں اور آپ نے اپنے مقالے میں ان اہم فکری و عملی اقدامات کو گنوایا ہے جو عصر حاضر میں تحریک اسلامی کی کامیابی کے لیے ضروری ہیں۔ 'احیائے اسلام کے اہداف اور نظریاتی بنیادوں' کے عنوان سے انہوں نے اسلامی احیائی تحریک کے کرنے کے چار کاموں کا ذکر کیا ہے:

۱۔ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر انفرادی اصلاح کو فروغ دینا۔

۲۔ اسلامی اقدار کو معاشرتی، اقتصادی اور انتظامی ڈھانچوں میں شامل کرنا۔

۳۔ شرعی قانون کے تحت ایک اسلامی ریاست قائم کرنا جو انصاف، مساوات اور اخلاقی پاکیزگی کو فروغ دے۔

۴۔ لادینیت اور مغربیت کا مقابلہ کرتے ہوئے سیاسی اور معاشرتی زندگی کو اسلام کی طرف موڑنا۔

پھر عملی کاموں میں تعلیم کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ "اسلامی تعلیمات کی

بنیاد پر تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں، جو عقیدہ پر مبنی تعلیم دیتے ہوئے قرآن وسنت کے مطابق کردار سازی کو مرکز بنائیں اور ایمان کی پرورش کریں۔ ان اداروں میں طلبہ کو سِول سروس میں کردار ادا کرنے کے لیے بھی تیار کرنا چاہیے۔ ان کورسز میں مذہبی اور عمومی دونوں مضامین شامل ہونے چاہئیں۔''

ڈاکٹر ابصار احمد صاحب نے بجا طور پر اس طرف توجہ دلائی ہے کہ جب تک تحریک اسلامی ایسے علمی افراد تیار نہیں کرتی جو مغرب کی حقیقت اور اس کے فکری تناظر کو سمجھیں اور اعلیٰ علمی سطح پر دلائل کے ساتھ، اس کو ردّ کریں اور اس کے مقابلے میں اسلام کی علمی وفکری رفعت کو دنیا پر مبرہن کریں اور اس کا عصر حاضر میں قابل عمل ہونا ثابت کریں، اس وقت تک دنیا اسلام کو اہمیت دینے پر آمادہ نہ ہوگی اور نہ اسلام کو بحیثیت نظریۂ حیات قبول کرنے پر آمادہ ہوگی۔

ہماری رائے میں اس علمی وفکری کام کے لیے ہر مسلم ملک میں کم از کم ایک ایسی یونیورسٹی قائم ہونی چاہیے جو مغربی علوم پڑھانے کی بجائے انہیں ردّ کرے اور قرآن وسنت کی روشنی میں، امت کے ماضی کے تجربات اور موجودہ چیلنجز کو سامنے رکھتے ہوئے علوم، نصابات، تربیت اور تحقیق کے مناہج کی اسلامی تشکیلِ نو کرے اور اعلیٰ علمی صلاحیت رکھنے والے افراد تیار کرے جو ردّ مغرب اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے اہل اور علمبردار ہوں۔

سید سردار علی صاحب اپنے مقالہ بعنوان 'اسلامی تہذیب کو درپیش مشکلات' میں وہی رونا ہوتے ہیں جو مغرب کی تہذیبی چکا چوند سے مرعوب اذہان کا خاصہ ہے۔ وہ سائنس وٹیکنالوجی میں مغرب کی ترقی کو اس کی فکری وتہذیبی برتری کا سبب گردانتے ہیں۔ یہ نقطۂ نظر بظاہر بہت جاندار نظر آتا ہے لیکن حقیقتاً سطحی ہے اور ذرا گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو آدمی سمجھ جاتا ہے کہ سائنس وٹیکنالوجی میں مغرب کی پیش رفت اور اس کی حربی، معاشی وسیاسی قوت اور تفوق درحقیقت دنیاوی ترقی کا مظہر اور نتیجہ ہے، نہ کہ اس کا سبب۔ مغرب کی ترقی کا حقیقی سبب کیا ہے اور مسلمانوں کے زوال کے حقیقی اسباب کیا ہیں؟ ہم نے اپنی تحریروں میں ان پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے خصوصاً اپنی کتاب 'مسلم نشأۃ ثانیہ-**عروج امت مسلمہ**'' میں۔

خلاصہ اس کا چند جملوں میں یہ ہے (اگرچہ زیادہ اختصار عموماً مخلِ فہم ہوتا ہے) کہ کسی قوم

کے عروج اور غلبے کا انحصار اس کے بنیادی نظریۂ حیات سے اس کی کمٹمنٹ پر ہوتا ہے۔ اس کمٹمنٹ کے نتیجے میں انسان کے اندر وہ اہلیتیں پیدا ہوجاتی ہیں جو دنیا میں ترقی اور عروج کے لیے ضروری ہیں۔ اگر صحیح نظریۂ حیات پر عامل کوئی قوم/تہذیب موجود ہو اور وہ صالح بھی ہو اور صلاحیت بھی رکھتی ہو تو وہی دنیا میں میرٹ پر کامیاب ہوگی اور دوسروں پر غالب آئے گی لیکن اگر ایسی قوم وتہذیب موجود نہ ہو تو وہ قوم اس کی جگہ لے لے گی جو اپنے نظریۂ حیات سے کمٹمنٹ رکھتی ہوگی اگرچہ اس کی نظری بنیادیں صحیح فکر پر مبنی نہ ہوں۔ مسلمان اس لیے زوال پذیر ہوئے کہ وہ اپنے دین اور اپنے نظریۂ حیات سے حقیقی وابستگی کھو بیٹھے جس کی وجہ سے ان کے اندر وہ بنیادی اہلیتیں پیدا ہونا بند ہوگئیں جو اس دنیا میں میرٹ پر آگے بڑھنے کے لیے ناگزیر ہیں۔ دوسری طرف اسلام اور مسلمانوں کے پرانے حریف میں متعدد وجوہ سے یہ خوبیاں ابھر کر سامنے آگئیں چنانچہ مسلمان ان کے مقابلے میں مغلوب ہوگئے۔

اب اس کا حل یہی ہے کہ تعلیمِ کتاب وحکمت وتزکیۂ نفس کے ذریعے ایسے افراد تیار کیے جائیں جیسے نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کی صورت میں کیے تھے جن کی قوت کا منبع ایمان اور تقویٰ تھا اور جنہوں نے انفرادی اور اجتماعی زندگی (معاشرہ اور ریاست) میں اسلام پر عمل کرکے اور اسلام کو دوسرے ادیان پر غالب کرکے دنیا کو دکھادیا کہ دنیا اور آخرت میں کامیابی کا راستہ صرف یہی ہے۔

قولِ فیصل

ہم کہتے ہیں کہ جماعت اسلامی پاکستان کی قیادت اور ارکان وکارکنان اگر امیر جماعت اسلامی ہند اور نائب امیر جماعت اسلامی ہند ہی کی تجاویز پر عمل کرنے کا سوچیں تو جماعت اسلامی پاکستان صحیح رُخ میں آگے بڑھنا شروع ہوجائے گی۔ باقی اہل علم کے بارے میں تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ جماعتیے نہیں ہیں اور انہیں ہمارے نظریات اور مسائل کا گہرا ادراک نہیں ہے لیکن جماعت اسلامی ہند کے امیر اور نائب امیر کے بارے میں تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے۔

تبصرۂ کتب حافظ محمد عمران طحاوی

کتاب نما

مولانا ظفر علی خان اور اُن کا عہد: از حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی

بابائے صحافت کا لقب پانے والے مولانا ظفر علی خان ۱۹/ جنوری ۱۸۷۳ء میں کوٹ مہرتھ، شہروزیرآباد، ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مشن ہائی سکول وزیرآباد سے جبکہ گریجوایشن علی گڑھ یونیورسٹی سے اس وقت مکمل کی جب سرسید، مولانا شبلی نعمانی اور حالی جیسے اساتذہ میسر تھے۔ مولانا ظفر علی خان صحافت وخطابت اور شاعری میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ فی البدیہہ شعر کہنے کا ملکہ رکھتے تھے۔ آپ کا یہ قطعہ بہت مشہور ہے ؎

نماز اچھی، روزہ اچھا، زکوٰۃ اچھی، حج اچھا مگر میں باوجود اس کے مسلماں ہو نہیں سکتا
نہ جب تک کٹ مروں میں خواجۂ بطحا کی عزت پر خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

مذکورہ کتاب مولانا ظفر علی خان ٹرسٹ نے چھپوائی ہے۔ بہترین سفید کاغذ پر مجلد کتاب ہے۔ مصنف کتاب حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی کو مولانا سے خاص انس اور تعلق تھا مولانا کی شخصیت تحریکِ پاکستان میں کسی عظیم نعمت سے کم نہ تھی۔ آپ تحریکِ پاکستان کے روحِ رواں تھے۔ حکیم صاحب کو بھرپور موقعہ ملا مولانا کو قریب سے دیکھنے کا۔ اس کتاب میں مصنفِ کتاب نے مولانا ظفر علی خان کی گوناگوں صلاحیتوں کو یکجا کر دیا ہے۔ حکیم حضرات جس طرح قیمتی اجزاء کو اکٹھا کر کے کوئی اکسیر تیار کرتے ہیں اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ حکیم صاحب نے اس کتاب کی صورت میں علم دوست حضرات کے لیے ایک اکسیر تیار کی ہے جو ہر دور میں داد و تحسین وصول کرے گی۔ مولانا کی وہ شاعری جو ان کی کسی تصنیف میں بھی نہیں ملتی آپ کو اس سے یہاں حظ اٹھانے کا موقع میسر آئے گا۔ تحریکِ قیامِ پاکستان کے بہت سے مخفی گوشوں سے آگاہی نصیب ہوگی۔ آپ نے ردّ قادیانیت اور تحریکِ ختمِ نبوت میں بھی بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ صرف کتاب نہیں بلکہ انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں تاریخ پاکستان اور تحریک پاکستان دونوں یکجا پڑھنے کو ملیں گی۔ نوجوان طلبہ اور بزرگ حضرات دونوں اس کتاب سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

ملنے کا پتہ: مولانا ظفر علی خان ٹرسٹ 21.C نون ایونیو نیو مسلم ٹاؤن، لاہور، فون: 042-35846676

Digital ridesharing centres, which turn all of us into taxi drivers, advertise with appeals to community, too. But it is mistaken to claim — as Jeremy Rifkin does in his newest book, *The Zero Marginal Cost Society* — that the sharing economy has sounded the end of capitalism and inaugurated a communally-oriented society in which sharing is valued more highly than owning. The opposite is the case: the sharing economy ultimately leads to the total commercialization of life.

The change that Rifkin celebrates - from owning to "access" - has not freed us from Capitalism. People without money still have no access to sharing. Even in the age of access, we still live within what Didier Bigo has dubbed the "Ban-opticon," and those without means remain excluded. "Airbnb" - the computerized marketplace that turns every home into a hotel - has even made hospitality a commodity.

The ideology of "community" or a "collaborative commons" leads to the total capitalization of existence. It makes it impossible to be friendly without a purpose. In a society of continuous, mutual feedback, friendship, too, becomes commercialized. People are friendly to get better ratings.

The tough logic of Capitalism prevails even at the heart of the sharing economy. As nice as it may be to share, no one gives away anything for free. Capitalism reaches fulfillment when it sells communism as a commodity. Communism as a commodity spells the end of revolution.

Today, no collaborative, networked multitude exists that might rise up in a global mass of protest and revolution. Instead, the prevailing mode of production is based on lonesome and isolated self-entrepreneurs, who are also estranged from themselves. Companies used to compete with each other. Within each enterprise, however, solidarity could occur. Today, everyone is competing against everyone else — and within the same enterprise, too. Even though such competition heightens productivity by leaps and bounds, it destroys solidarity and communal spirit. No revolutionary mass can arise from exhausted, depressive, and isolated individuals.

Neoliberalism cannot be explained in Marxist terms. The famous "alienation" of labour does not even occur. Today, we dive eagerly into work - until we burn out. The first stage of burnout syndrome, after all, is euphoria. Burnout and revolution are mutually exclusive. Accordingly, it is mistaken to believe that the Multitude will cast off the parasitic Empire to inaugurate a communist society.

The sharing economy leads to the total commercialization of life

How do matters stand with communism today? "Sharing" and "community" are constantly being invoked. The sharing economy is supposed to replace the economy of property and possession. Sharing is Caring runs the maxim of the "Circlers" in Dave Eggers's recent novel: to share is to cure, so to speak. The sidewalk leading to the Circle corporate office is emblazoned with slogans such as Community First and Humans Work Here. A more honest motto would be, Caring is Killing.

does not even recognize that it has been subjugated. The subject thinks she is free. This mode of domination neutralizes resistance quite effectively. Domination that represses and attacks freedom is not stable. The neoliberal regime proves stable by immunizing itself against all resistance, because it makes use of freedom instead of repressing it. Suppressing freedom quickly provokes resistance; exploiting freedom does not.

Any disciplinary power that expends effort to force human beings into a straitjacket of commandments and prohibitions proves inefficient. It is significantly more efficient to ensure that people subordinate themselves to domination on their own.

After the Asian financial crisis, South Korea stood paralysed and shocked. The IMF intervened and extended credit. In return, the government had to assert its neoliberal agenda by force. This was repressive, positing power — the kind that often proves violent and differs from system-preserving power, which manages to pass itself off as freedom.

According to Naomi Klein, the state of social shock following catastrophes such as the financial crisis in South Korea — or the current crisis in Greece - offers the chance to radically reprogram society by force. Today, there is hardly any resistance in South Korea. Quite the opposite: a vast consensus prevails - as well as depression and burnout. South Korea now has the world's highest suicide rate. People enact violence on themselves instead of seeking to change society. Aggression directed outward, which would entail revolution, has yielded to aggression directed inward, against oneself.

The subjugated subject is not even aware of its subjugation

Any disciplinary power that expends effort to force human beings into a straitjacket of commandments and prohibitions proves inefficient. It is significantly more efficient to ensure that people subordinate themselves to domination on their own. The efficacy defining the system today stems from the fact that, instead of operating through prohibition and privation, it aims to please and fulfill. Instead of making people compliant, it endeavours to make them dependent. This logic of neoliberal efficiency also holds for surveillance. In the 1980s, to cite one example, there were vehement protests against the German national census. Even schoolchildren took to the streets.

From today's perspective, the information requested therein— profession, education levels, and distance from the workplace — seem almost laughable. At the time, people believed that they were facing the state as an instance of domination wresting data from citizens against their will. That time is long past. Today, people expose themselves willingly. Precisely this sense of freedom is what makes protest impossible. In contrast to the days of the census, hardly anyone protests against surveillance. Free self-disclosure and self-exposure follow the same logic of efficiency as free self-exploitation. What is there to protest against? Oneself? Conceptual artist Jenny Holzer has formulated the paradox of the present situation: "Protect me from what I want."

It is important to distinguish between power that posits and power that preserves. Today, power that maintains the system assumes a "smart" and friendly guise. In so doing, it makes itself invisible and unassailable. The subjugated subject

that stabilizes a system internally. As is well known, Margaret Thatcher, the standard bearer of neoliberalism, treated unions as "internal enemies" and combated them violently. For all that, using force to establish the neoliberal agenda does not amount to system-preserving power.

System-preserving power is not repressive, but Seductive

In disciplinary and industrial society, system-preserving power was repressive. Factory workers were brutally exploited by factory owners. Such violent exploitation of others' labour entailed acts of protest and resistance. There, it was possible for a revolution to topple the standing relations of production. In that system of repression, both the oppressors and the oppressed were visible. There was a concrete opponent - a visible enemy - and one could offer resistance.

The neoliberal system of domination has a wholly different structure. Now, system-preserving power no longer works through repression, but through seduction - that is, it leads us astray. It is no longer visible, as was the case under the regime of discipline. Now, there is no longer a concrete opponent, no enemy suppressing freedom that one might resist.

Neoliberalism turns the oppressed worker into a free contractor, an entrepreneur of the self. Today, everyone is a self-exploiting worker in their own enterprise. Every individual is master and slave in one. This also means that class struggle has become an internal struggle with oneself. Today, anyone who fails to succeed blames themself and feels ashamed. People see themselves, not society, as the problem.

Byung-Chul Han[1]

Why revolution is no longer possible?

A year ago, I responded to Antonio Negri's presentation at the Berliner Schaubühne, where two critiques of capitalism collided. Negri had enthused about global resistance to "Empire," the neoliberal system of domination. He presented himself as a Communist revolutionary and referred to me as a skeptical academic.

Zealously, he invoked the "Multitude" - the networked mass of protest and revolution that he clearly trusted to bring the Empire to a fall. The standpoint of the Communist revolutionary struck me as overly naïve and removed from reality.

Accordingly, I tried to say why revolution is no longer possible today.

Why is the neoliberal system of domination so stable? Why is there so little resistance to it? Why does the resistance that does occur so quickly come to naught? Why, despite the ever-expanding divide between rich and poor, is revolution no longer possible? To explain this state of affairs, we need a precise understanding of how power and domination function today.

Anyone wishing to install a new system of rule must eliminate resistance. The same holds for the neoliberal order. Implementing a new system of dominion requires an instance of power that posits; often, this entails the use of force. However, power that posits a system is not identical to power

[1]University of the Arts, Berlin, Germany.